علی محمد خسرو

وائس چانسلر: ۱۹۷۴-۱۹۷۹

ہم جس زمین پر بھی رہے آسماں رہے

از

پروفیسر محمد اقبال

شعبۂ علم نباتات، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی-۶۲

پروفیسر علی محمد خسرو کا نام ذہن میں آتے ہی ان بے شمار خوبصورت اشعار اور لطیفوں کی یاد آجانا ضروری ہے جو ان کی شیریں زبان اور متبسم لبوں سے وارد ہو کر برسہا برس احباب کو محظوظ کرتے رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر ان ہی میں سے ایک ہے اور غالباً علی گڑھ کے تعلق سے خسرو صاحب کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے:

مٹی خراب تھی ترے کوچہ کی ورنہ دوست
ہم جس زمین پر بھی رہے آسماں رہے

میں نے علیگڑھ میں بدرالدین طیّب جی کا زمانہ تو نہیں دیکھا مگر سینیر ساتھیوں سے یہ سنا ضرور ہے کہ علیگڑھ میں ان کا استقبال ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی بگھی کو گھوڑوں کے بجائے طلبا نے کھینچ کر ریلوے اسٹیشن سے یونیورسٹی کیمپس تک پہنچایا تھا۔ بہرکیف طیّب جی کا نہ سہی، خسرو صاحب کا استقبال میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ بھی عجب جذباتی لمحات تھے، علیگڑھ ریلوے اسٹیشن پر اندر اور باہر حدنگاہ تک یونیورسٹی کے ہزارہا طلبا، اساتذہ اور دیگر اسٹاف کا ایک جم غفیر موجود تھا جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچی، خیر مقدمی نعروں سے اسٹیشن کی فضا گونج اٹھی۔ کریم کلر کی شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامے میں ملبوس وجیہ اور خوب رو علی محمد خسرو صاحب یونیورسٹی برادری کی سربراہی کے لیے علی گڑھ آپہنچے تھے۔ پہلی نظر میں ہی انہوں نے لوگوں کا من موہ لیا، وفورِ مسرت سے سب کی آنکھیں نم تھیں، طلبا نے انہیں کاندھوں پر بٹھایا اور پھولوں کے ہار اس درجہ ان پر لاد دیے کہ شکل نظر آنا بھی محال ہو گیا۔ خدا خدا کر کے بمشکل کار تک پہنچے۔ چیونٹی کی چال سے کار نے رینگنا شروع کیا، راستے بھر ہزاروں منتظرین کی جانب سے پھولوں کی بارش ہوتی رہی، عجب دل فریب سماں تھا، اسٹیشن سے یونیورسٹی کی جامع مسجد تک ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ میں نے تقریبا ۲۲ برس علیگڑھ میں گزارے، پروفیسر عبدالعلیم، علی محمد خسرو، سید حامد اور سید ہاشم علی اختر صاحبان کی وائس چانسلری کے دور دیکھے، اس اثناء میں دو ہی مواقع ایسے آئے جب یونیورسٹی برادری کی جانب سے بے مثال جوش و خروش اور مسرت و شادمانی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ ایک تو خسرو صاحب کی علی گڑھ آمد پر اور دوسرے حامد صاحب کی علیگڑھ سے روانگی پر۔

مزار سرسید پر حاضری کے بعد خسرو صاحب سیدھے کینیڈی ہال تشریف لے گئے جہاں انہیں طلبا کو خطاب کرنا تھا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں اور ہال کے باہر والے میدان میں کہیں تِل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ خسرو صاحب نے اردو میں تقریر شروع کی۔ ایسی شیریں بیانی اور سہل زبانی کہ مجمع مسحور ہو کر رہ گیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بے تکان بولنے کے بعد انہوں نے پینترا بدلا اور بقیہ بات انگریزی میں کر لینے کی اجازت چاہی۔ اب جو انگریزی شروع ہوئی تو ایسا لگا کہ شاید یہی موصوف کی مادری زبان ہے۔ غضب کی ترسیل اور بلا کی روانی، پہلی بار یہ بھی احساس ہوا کہ انگریزی میں محض غراہٹ اور جھٹکے ہی نہیں ہوتے بلکہ سحر، شیرینی اور ترنم بھی اس سے وابستہ ہیں۔ غرض یہ کہ کافی زمانے کے بعد یونیورسٹی کو ایک وجیہ، خوب رو، خوش زبان، قادر بیان، بااخلاق اور تیز و طرار وائس چانسلر ہاتھ آگیا تھا۔ نازک لمحات میں پیچیدہ صورتِ حال پر قابو پانے کی بے پناہ صلاحیت سے موصوف کی ذات متصّف تھی، مزاج میں حاکمیت بالکل نہ تھی اور خیال رکھتے تھے کہ ان کے قول و قلم سے کسی کو جراحت نہ پہنچے۔ یہ الگ بات رہی کہ موصوف کی اس نرم روی سے کیمپس میں کئی فتنوں کو سر ابھارنے کا موقع بھی مل گیا۔

خسرو صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدر آباد کے مدرسہ عالیہ سے اور ثانوی تعلیم نظام کالج سے ہوئی، وہ ہمیشہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن پر رہے۔ بی. اے کے امتحان میں انگریزی میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر مہاراجہ کشن پرشاد گولڈ میڈل حاصل کیا۔ مدراس یونیورسٹی سے ۱۹۴۷ء میں ایم اے کیا اور اس میں بھی اوّل رہے۔ وہ پندرہ سال کی عمر سے ہی ٹینس کھیلنے لگے تھے اور اس میں بھی امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے نظام کالج کی ڈبل چمپین شپ جیت کر کھیل کے میدان بھی اپنی برتری ثابت کی۔ چونکہ ان کے خاندان کے بزرگ پچھلی تین پشتوں سے ریونیو ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ رہے تھے لہٰذا خسرو صاحب کے والد محترم ان کو آئی سی ایس بنانا چاہتے تھے لیکن ایم. اے کر لینے کے بعد حکومت حیدر آباد کے ایک اسکالرشپ پر وہ انگلستان چلے گئے اور لیڈز یونیورسٹی سے بی۔اے (آنرز) اور پھر پی ایچ. ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ خسرو صاحب فرماتے تھے کہ اردو تو ان کی بچپن سے ہی کافی اچھی رہی مگر ابتدا میں انگریزی کمزور تھی، ان کے نانا غلام دستگیر صاحب نے جو حضور نظام کی معزّز کمیٹی صَرف خاص کے سیکریٹری تھے اور بعد میں اطراف بلدہ کے کلکٹر بن گئے تھے، انگریزی سیکھنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کام کے لیے ایک استاد رکھ لیا۔ یہ صاحب (مسٹر ایڈز ہڈ) جو آدھے آسٹریلین اور آدھے انڈین تھے، ان کے گھر پہ ہی رہتے تھے، خسرو صاحب اس وقت چھٹی کلاس میں تھے۔ انہوں نے بھی استاد موصوف سے استفادہ کیا اور انگریزی میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ تقریری مقابلوں میں شرکت کا انہیں بچپن سے شوق تھا، نظام کالج کے زمانے میں آل انڈیا احمد محی الدین میموریل تقریری مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا جو اس وقت سب سے بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ لیڈز یونیورسٹی کی ڈبیٹنگ سوسائٹی سے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں پہلا انعام حاصل کیا اور اگلے برس اس سوسائٹی کے صدر بھی بنائے گئے۔ یونیورسٹی کی طلباء یونین میں رکن منتخب ہونے والے وہ پہلے ہندوستانی تھے۔ یہی نہیں کہ وہ منتخب ہوئے بلکہ اس الیکشن میں سب سے زیادہ ووٹ بھی انہی کو ملے۔ جس سے طلباء برادری میں ان کی بے پناہ مقبولیت کا اظہار ہوا۔ ایک اہم بات یہ ہوئی کہ آزاد حیدر آباد کی تائید میں برطانوی پارلیامنٹ میں ہوئی ونسٹن چرچل کی تقریر کا جواب دینے کے لیے جواں سال خسرو کو مدعو کیا گیا اور انہوں نے اپنی تقریر میں چرچل کے خیال کی تردید کرتے ہوئے حیدر آباد کو ہندوستان کا ایک حصہ تسلیم کیے جانے پر زور دیا۔ اس وقت حیدر آباد کی سیاست کے پیش نظر یہ ایک غیر متوقع اور غیر معمولی جسارت کا اظہار تھا۔ جمہوریت کی تائید میں کی گئی اس تقریر کو بعد میں مانچسٹر گارڈین نے اپنے ایک اداریہ میں بطور حوالہ استعمال کیا تھا۔ [۱]

برطانیہ سے واپسی پر انہیں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے لیکچررشپ کی آفر ملی پھر کچھ برس بعد دلی اسکول آف اکنامکس میں محض ۳۱ سال کی عمر میں براہ راست پروفیسر بنا دیے گئے۔ بعد میں وزیراعظم اندرا گاندھی کی ایما پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ دلی اسکول آف اکنامکس میں ۱۷ سالہ تدریس وتحقیق کے بعد وہ ملک کے صف اوّل کے ماہرین اقتصادیات میں شمار ہونے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امرتیہ سین، جگدیش بھگوتی اور کے این راج جیسے جید علما اس اسکول کے اساتذہ میں شامل تھے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری اچانک اور غیرمتوقع طور پر خسرو صاحب کے حصے میں آگئی تھی۔ ہوا یہ کہ وزیرتعلیم پروفیسر نورالحسن صاحب کی ایما پر وائس چانسلرشپ کے لئے تین ناموں کا جو پینل صدر جمہوریہ ہند کی منظوری کے لیے بھیجا گیا تھا اسے صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب نے رد کردیا۔ لہٰذا دوبارہ نئے چہروں کی تلاش شروع ہوئی اور تب وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی نظر انتخاب خسرو صاحب پر جا ٹکی۔ اس وقت کے وزیراطلاعات شری اندر کمار گجرال اور وزرات اطلاعات کے سکریٹری جناب انور جمال قدوائی کی وساطت سے خسرو صاحب کو راضی کیا گیا۔ دوبارہ جو پینل تشکیل ہوا اس میں خسرو صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ صدر جمہوریہ نے ان کے نام پر اتفاق کیا اور آناً فاناً موصوف کو علی گڑھ بھیج دیا گیا۔[۲]

خسرو صاحب کے پروفیشنل کیریر میں یہ بات بھی بہت اہم رہی کہ جو بھی ذمہ داریاں اور عہدے ان کو ملے، مثلاً جامعہ عثمانیہ کی لیکچررشپ، دلی یونیورسٹی کی پروفیسرشپ، انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ کی ڈائرکٹرشپ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ اور بعد میں چانسلرشپ، جرمنی کی سفارت کاری، آغا خاں فاؤنڈیشن (انڈیا) کی صدارت، فائنشیل ایکسپریس کی ایڈیٹرشپ، مرکزی پلاننگ کمیشن کی رکنیت، مرکزی فائنس کمیشن کی صدارت، فیڈریشن آف انڈو جرمن سوسائٹیز کی صدارت، خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی صدارت، نیشنل کمیشن آف ایگریکلچر کی رکنیت، ایرانڈیا کی ڈائرکٹرشپ، ریزروبینک آف انڈیا کی ڈائرکٹرشپ اور اکنامک ایڈوائزری کونسل آف پرائم منسٹر کی رکنیت وغیرہ، ان کیلئے وہ خود کبھی درخواست گزار نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ ان کو عہدے کی پیشکش کی گئی۔ کہتے تھے زندگی میں صرف ایک بار عرضی ڈالی تھی اور وہ تھی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریڈرشپ کے لیے، اور اسی میں ناکامی مقدّر بنی، اور وہ بھی ایسی دائمی کہ زندگی میں کبھی ریڈر بن ہی نہ سکا۔ ویسے ایک طرح سے یہ موصوف کے حق میں اچھا ہی رہا کیوں کہ اگلے سال ہی ان کو دلّی یونیورسٹی کی جانب سے پروفیسرشپ کی پیشکش ہوگئی تھی۔ علی گڑھ آجانے پر یہ بھی ممکن تھا کہ کیمپس کی سیاست کا ذائقہ لگ جاتا اور بہت سے دیگر ساتھیوں کے مانند موصوف بھی کنوئیں کے مینڈک بن کررہ جاتے۔ اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکرحسین صاحب نے بعد میں مبینہ طور پر اعتراف کیا کہ علیگڑھ میں وہ خسرو کے ساتھ انصاف نہیں کرپائے تھے۔

خسرو صاحب فرماتے تھے:

''میراں جی شمس العشاق کی مثنوی وصیت النور میں دی گئی تفصیل کے مطابق ہمارا خاندانی شجرہ حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ دادا مرحوم سید جعفرحسین کے قول کے مطابق ہم لوگ سنّی ہیں مگر شیعوں سے دور نہیں ہیں، حنفی تفضیلی ہیں اور حضرت علی کی فضیلت کو مانتے ہیں۔''[۲]

اردو شعروادب سے خسرو صاحب کی دلچسپی مدرسہ عالیہ کے دور طالب علمی ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ وہاں پر وہ طلباء یونین کے صدر منتخب ہوئے تو انہوں نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں پڑھی جانے والی جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، مخدوم محی الدین، مجروح سلطانپوری اور آفتاب علی مہر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کے طویل حصے ان کو آخر زمانے تک ازبریاد تھے۔ ان کے ذہن میں حکایات واشعار کا ایک زبردست ذخیرہ محفوظ تھا جن کا برمحل استعمال کرنے میں وہ طاق تھے۔ یادداشت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ پوری پوری نظمیں ایک سانس میں سناجاتے تھے۔

خسرو صاحب بظاہر بڑے دل پھینک اور آزاد خیال نظر آتے تھے۔ علیگڑھ میں ان کے کچھ معاشقوں کا چرچا بھی رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علیگڑھ والے ''پر'' کا ''کوّا'' بنادینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر خسرو صاحب ایک خدا ترس، نیک طینت اور راسخ العقیدہ انسان تھے۔ عہد شباب میں وہ برسوں انگلستان میں علمی اور ثقافتی محفلوں کی جان بنے رہے مگر شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ خواجہ شاہد صاحب (سابق رجسٹرار، جامعہ ملیہ اسلامیہ) بتلاتے ہیں کہ مشرق وسطی کے ایک سفر کے دوران انہیں خسرو صاحب کے ساتھ ایک ہی کمرے میں قیام کا موقع ملا تو دیکھا کہ موصوف صبح سویرے اٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہوجاتے تھے۔ جب تک شاہد صاحب بیدار ہوتے، خسرو صاحب نماز فجر سے فارغ ہوکر چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار بینی کرتے نظر آتے تھے۔[۳]

معروف مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کا بیان ہے کہ ایک بار حکومت ہند کی جانب سے حج کے موقع پر بھیجے گئے خیرسگالی وفد میں وہ بھی خسرو صاحب کے ہم رکاب تھے۔ تین ہفتے تک مقامات مقدسہ پر ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو خسرو صاحب بولے ''اب ہم اللہ کے گھر سے نکل کر اپنے گھر جارہے ہیں'' قیام مدینہ کے دوران انکا بیشتر وقت مسجد نبوی میں گزرتا تھا۔ خصوصاً عصر کی نماز سے عشاء کی نماز کے بعد تک وہیں بیٹھا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ اس پورے عرصۂ قیام کے دوران انہوں نے کبھی خسرو صاحب کی زبان سے معاشیات، معیشت اور مالیات کی کوئی بات نہیں سنی، اس کے برعکس پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ تعلیمات قرآن اور تاریخ اسلام کے بارے میں خسرو صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع اور محققانہ ہے۔[۴]

خسرو صاحب کی قوت ارادی بھی لاثانی تھی۔ ایام جوانی میں ایک بار دل میں یہ خیال آگیا کہ رکشا میں سواری کرنا، جسے اپنے ہی جیسا ایک دوسرا انسان کھینچ رہا ہوتا ہے، کچھ غیر مناسب سا لگتا ہے، بس اس دن کے بعد کبھی رکشا میں سوار نہیں ہوئے۔ خسرو صاحب کے ایک قریبی دوست اور جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد میں انگریزی کے سابق پروفیسر جناب سراج الدین اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ خسرو کو سگریٹ نوشی کا شوق تھا۔ ایک دن اچانک من میں ٹھان لی کہ اب سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، مگر جب اعصاب میں اینٹھن شروع ہوئی اور دھواں اڑانے کی خواہش نے زور پکڑا تو منطقی ذہن نے یہ راستہ سُجھایا کہ سگریٹ ہی تو چھوڑنے کا عہد کیا تھا، بیڑی سے ترک تعلق کا تو کوئی شائبہ ذہن میں نہیں تھا، لہٰذا اس کے استعمال کا جواز تو بنتا ہے۔ چناں چہ سگریٹ سے کنارہ کشی قایم رکھی اور طلب محسوس ہونے پر بیڑی یا سگار سے کام چلایا[۵]۔ مگر علیگڑھ کے بہت سے احباب اس دعوے کی نفی کرتے ہیں، مثلاً معروف قلم کار ثاقب صدیقی فرماتے ہیں کہ ''خسرو صاحب سگار کے رسیا تھے، مگر سگریٹ نوشی سے بھی کوئی عار نہیں تھا۔ ان کا سگریٹ پینے کا انداز بھی معشوقانہ تھا، میں نے کسی اور کو اس طرح سگریٹ پیتے نہیں دیکھا۔ وہ سگریٹ کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اس طرح پکڑتے تھے جیسے چھونے میں ڈرلگ رہا ہو یا چھونا پسند نہ کرتے ہوں۔ پھر جھک کر دو چار کش لگاتے اور سگریٹ رکھ کر سیدھے بیٹھ جاتے تھے۔ ان کے پاس دس بارہ قسم کے سگریٹ کے پیکٹ، اس سے کہیں زیادہ اقسام کے بیڑی کے بنڈل اور خاصی تعداد میں سگار ہوا کرتے تھے، خدا جانے جمع خوری کا یہ شوق کیوں تھا، شاید ضرورت اور موقع محل کے اعتبار سے سگریٹ، بیڑی کا انتخاب کرتے ہوں گے۔''[۶]

خسرو صاحب کی خوش گفتاری متعلقین کو ہمیشہ یاد آئے گی۔ ان کی تقریریں دلکش، پرمغز اور کانوں میں رس گھولنے والی ہوا کرتی تھیں۔ ترسیل افکار میں بلا کی روانی مگر کیا مجال کہ خیال یا اظہار خیال میں ذرا سا بھی جھول آجائے۔ تقریر کتنی بھی طویل ہو جائے، سامعین تصویر شوق بنے رہتے تھے اور ترنم ریزی کا سلسلہ جب ختم ہوتا تو خواہش ہوتی تھی کہ کاش مزید کچھ دیر سلسلۂ کلام جاری رہتا۔ خسرو صاحب کے خطاب میں نقص تلاش کرنا ہی اگر مقصود ہو تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات موصوف کے طرز تخاطب میں استادیت کا غلبہ نظر آتا تھا، اور شاید وہ بھول جاتے تھے کہ مخاطب طلبا نہیں ہیں لہٰذا موضوع کی صراحت کیلئے تکرار ضروری نہیں ہے۔ یہ بات بھی

بڑی حیرت انگیز تھی کہ وہ ہر موضوع پر خواہ وہ ان کے تخصص سے کتنا بھی دور ہو، بڑے اعتماد کے ساتھ بول لیتے تھے اور بہت سے فنی نکات پر رائے زنی کر کے دعوت فکر دے جاتے تھے۔ قیام علی گڑھ کے دوران ایک بار وہاں کے شعبۂ علم نباتات میں آفتابی شعاعوں کو ہریالی میں محبوس کرنے کے عمل پر ایک سیمینار ہوا جس میں کئی ممتاز غیر ملکی سائنسداں بھی موجود تھے۔ برطانیہ کے مشہور پلانٹ فزیالوجسٹ فریبنک سالسبری کو کلیدی خطبہ پیش کرنا تھا۔ افتتاحی تقریب میں مجلس کی صدارت کے لیے خسرو صاحب تشریف لائے۔ صدارتی کلمات میں موصوف نے سیمینار کے موضوع پر ایسا جامع تبصرہ کیا کہ شرکائے محفل ہکا بکا رہ گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ پورے سیمینار میں اس جیسی کوئی دوسری تقریر نہیں ہوسکی تھی۔

ایسے ہی ایک موقع کا تذکرہ کرتے ہوئے دلّی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر امیر عارفی فرماتے ہیں کہ میں نے یونیورسٹی میں ایک ادبی سیمینار منعقد کیا جس کی صدارت خسرو صاحب کو سونپی گئی۔ اس موقع پر پروفیسر وحید اختر صاحب نے جدیدیت اور ادب کے موضوع پر تقریر کی۔ خالص ادبی ماحول تھا اور اردو ادب کے بہت سے سقراط و بقراط موجود تھے۔ خسرو صاحب سے چند کلمات کی درخواست کی گئی تو موصوف آدھا گھنٹہ بولے اور ادب کے باریک پہلوؤں پر اس اعتماد اور مہارت سے تبصرہ کیا کہ کیا ادیب اور کیا نقاد سبھی حیرت زدہ تھے۔[۱]

ایک بار خسرو صاحب کو سردار پٹیل میموریل خطبات کے لیے مدعو کیا گیا۔ بمبئی کے ماؤلنکر ہال میں انہیں دو لیکچرز دینا تھے۔ جب جانے میں محض تین دن رہ گئے تو اس وقت کے پرو وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع صاحب (مرحوم) نے ان سے دریافت کیا کہ تیار شدہ خطبات کے متن پر کیا وہ بھی ایک نظر ڈال سکتے ہیں۔ خسرو صاحب بولے ''بھئی خوب یاد دلایا، بس آج ہی سے تیاری شروع کر دیتے ہیں۔'' لیکن بقول پروفیسر شفیع صاحب، جس روز خسرو صاحب کو بمبئی کے لیے روانہ ہونا تھا اس دن انہوں نے اپنے دفتر کے دو اسٹینوگرافرز کو بلایا اور تقریباً تین گھنٹے اپنے خطابات کے موضوع پر بولتے رہے اور تاکید کی کہ اس کو ٹائپ کر کے دلی ہوائی اڈے پر مجھے دے دینا۔ بس اس طرح موصوف کے دونوں لیکچرز تیار ہو گئے اور بمبئی میں ان پر واہ واہ بھی خوب ہوئی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کچھ عرصہ بعد معاشیات کے ایک امریکی پروفیسر نے خسرو صاحب کو لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو بمبئی میں دیے گئے آپ کے خطبات کو میں اپنی آنے والی کتاب میں شامل کرنا چاہتا ہوں جو دنیا کے نامور ماہرین معاشیات کے مضامین پر مشتمل ہوگی۔[۷]

اسی طرح انجہانی پروفیسر وی۔ ایس ریکھی (سابق ڈین، فیکلٹی آف لاء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) بتایا کرتے تھے کہ انڈین لاء سوسائٹی کی ایک سالانہ کانفرنس میں خسرو صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا۔ ریکھی صاحب نے کانفرنس کے موضوع پر کچھ کتابیں خسرو صاحب کو بھجوا دیں تا کہ خطاب کی تیاری بہتر طور پر کی جاسکے۔ کہتے ہیں کہ روز آخر تک وہ کتابیں جوں کی توں رکھی رہیں اور خسرو صاحب انہیں پڑھنے کا موقع نہ نکال سکے۔ جب دلی کے لیے کار میں سوار ہونے لگے تو خسرو صاحب نے پروفیسر ریکھی کو بتایا ''میں نے آپ کی دی ہوئی کتابیں ساتھ میں رکھ لی ہیں، راستے بھر مطالعہ کریں گے۔'' سفر کا آغاز ہوا تو حسب معمول خسرو صاحب کی خوش گپیاں شروع ہو گئیں، پھر بلند شہر پہنچتے پر ان کی کھیر کھانے کی خواہش جاگ اٹھی۔ وہاں سے آگے بڑھے تو ریکھی صاحب نے کتابوں کی یاد دلائی، خسرو صاحب بولے ''بھئی خوب یاد دلایا، لایئے دیکھتے ہیں کتابیں کیا کہتی ہیں؟'' کچھ دیر موصوف نے کتابوں کے اوراق پلٹے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ دلی آ گئی۔ تقریر ہو گئی۔ سامعین کہہ رہے تھے کہ ایسی جامع اور مدلّل تقریریں بہت کم سننے کو ملتی ہیں۔ آج تو خسرو صاحب نے جیّد قانون دانوں کے بھی کان کاٹ دیئے۔

سید حامد صاحب کے دور اقتدار میں یونیورسٹی کورٹ کی ایک اہم میٹنگ میں کچھ متنازعہ مسائل پر بحث نے ایسا طول پکڑا اور تلخی اتنا زیادہ بڑھی کہ تشدد کے امکانات نظر آنے لگے۔ کرنل بشیر حسین زیدی اور بدرالدین طیب جی جیسے محترم سابق شیوخ الجامعہ کی دخل اندازی بھی حالات کی کشیدگی میں کوئی تخفیف نہ لا سکی، خسرو صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ کچھ فرمائیں۔ موصوف نے اپنی بات علاّمہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ شروع کی:

ناز ہے طاقت گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

پھر فصاحت و ظرافت کے لطیف جھونکے دھیرے دھیرے فضا کی کثافت کو تحلیل کرنے لگے، آخر کار الفاظ کی مٹھاس شدّت جذبات پر غالب آ گئی اور ایک بڑے ہنگامے کے خدشات یکسر رفع ہو گئے۔[۸]

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خسرو صاحب محض گفتار کے ہی غازی نہیں تھے بلکہ علم اقتصادیات و معاشیات میں بھی وہ ملک کے چنیدہ ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے ۔ انہوں نے دنیا کے جانے مانے ماہر اقتصادیات، پروفیسر اے جے براؤن، کی نگرانی میں ''دولت اور سُود'' کے موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی کام مکمل کیا تھا۔ بینکنگ، مالیات اور معیشت زرعی میں ان کی حیثیت بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی جاتی تھی۔ انہوں نے معاشیات کے باوا آدم ایڈم اسمتھ کی مشہور زمانہ تصنیف "Wealth of Nations" کے جواب میں "Poverty of Nations" تحریر کی۔ اپنی اس لازوال تصنیف میں خسرو صاحب نے دنیا کے ۲۴ ممالک کو پانچ معاشی خانوں میں تقسیم کر کے ان ممالک میں پائی جانے والی غریبی کی الگ الگ معاشی توجیہات پیش کیں اور اپنی مدلّل اور منفرد توضیح و تشریح کے ذریعہ دنیا بھر کے ماہرین معاشیات کو حیرت میں ڈال دیا۔ اپنے موضوعات سے متعلق متعدد اکادمیوں اور سوسائٹیوں کے وہ رکن بھی رہے اور صدر بھی۔ وہ برسوں حکومت ہند کے معتمد خاص بنے رہے، پلاننگ کمیشن اور فائنس کمیشن سے بھی وابستہ رہے۔ آغا خاں فاؤنڈیشن کی صدارت کی، ریزرو بینک آف انڈیا کے ڈائرکٹر رہے، سات برس ایکسپریس گروپ کے فائنشیل ٹائمز کے ایڈیٹر رہے، اسلامی ڈیولپمنٹ بینک (سعودی عرب) کے لیے پورے شمالی زون کے کنوینر اور آل انڈیا مرکزی پینل کے رکن بنے، اور اس بینک سے مسلم تعلیمی اداروں کو دس سال کے عرصہ میں پینتیس کروڑ روپے کی رقم فراہم کرائی۔ وہ گیارہ کتابوں اور تیس سے زیادہ مقالات کے مصنف تھے، ان کی قیادت و نگرانی میں تحقیق کر کے پندرہ لوگوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، گلبرگہ یونیورسٹی، کاکتیہ یونیورسٹی اور انگلینڈ کی لیڈس یونیورسٹی نے ان کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریوں سے نوازا، اور جرمن حکومت نے ۱۹۹۲ء میں موصوف کو 'کمانڈرس کراس آف دی آرڈر آف میرٹ' عطا کیا۔

خسرو صاحب کی شخصیت مشرق و مغرب کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی تھی۔ ان کے مزاج میں انگریزیت تھی مگر آباو اجداد سے ملنے والی عالمانہ اور صوفیانہ وراثت نے انہیں مشرقیت کا نمائندہ اور شعر و ادب کا دلدادہ بنائے رکھا۔ وہ حُسن کے مدّاح تھے اور حسینوں کے حلقے میں مقبول بھی تھے۔ ان کی شخصیت میں سکون اور ٹھہراؤ کی کیفیت بہت واضح تھی، تناؤ اور تفکر کو نہ وہ خود پر حاوی ہونے دیتے تھے نہ ماحول پر۔ بے حد سنجیدگی یا تلخ کلامی کے ماحول میں ان کا کوئی لطیفہ یا شعر تریاق کا کام کر جاتا تھا۔ موصوف کی خود اعتمادی کی ایک آنکھوں دیکھی مثال میں یہاں پر عرض کرنا چاہونگا' سرسیّد ہاؤس میں یونیورسٹی مجلس عاملہ (ایگزیکیٹو کونسل) کی میٹنگ چل رہی تھی' ایجنڈا کافی اہم تھا۔ کونسل کے اراکین کی جانب سے صدر جلسہ (شیخ الجامعہ) پر تابڑ توڑ حملے ہو رہے تھے۔ مقام تقریب کے باہر طلباء اور ریسرچ اسکالرز کا جمّ غفیر موجود تھا جن میں راقم بھی شامل تھا' ہم لوگ اپنے کچھ دیرینہ مطالبات کو لے کر یونیورسٹی انتظامیہ سے برہم تھے اور اس موقع پر احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے نعروں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد متعلقہ عمارت (سرسید ہاؤس) سے شیخ الجامعہ خسرو صاحب باہر نکلتے نظر آئے تو نعرے بازی تیز کر دی گئی۔ خسرو صاحب نے مظاہرین کے ہجوم پر نگاہ ڈالی تو بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے اسی طرف کو آنے لگے۔ لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید چوطرفہ دباؤ کام کر گیا ہے اور موصوف کچھ صلح صفائی کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا نعرے بازی میں اور شدّت

آ گئی۔ خسرو صاحب نے قریب آ کر احتجاجی طلبا کی مزاج پُرسی کی اور پھر ان کو دھوپ کی تپش سے بچ کر سایہ میں بیٹھنے کی تلقین کرنے لگے، پھر بولے کسی صاحب کی جیب میں اگر بیڑی پڑی ہو تو عنایت فرمائیں۔ اس غیر متوقع مطالبے سے ماحول یکسر تبدیل ہوگیا، چاروں طرف کھُسر پھُسر شروع ہوگئی، کچھ لوگ ہنسنے لگے، بہرحال کسی نے بیبا کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیڑی کا بنڈل بھی بڑھا دیا، موصوف نے وہیں بیٹھ کر دو چار کش لگائے، پھر بولے کہ اس مجمع میں اگر مِس لتا بھی موجود ہوں تو ایک غزل ہی سنا دیں (لتا کیمسٹری کی ایک طالبہ تھی جو بہت اچھا گاتی تھی اور خسرو صاحب کسی فنکشن میں اسے سن چکے تھے)۔ کچھ دیر بعد مظاہرین کا شکریہ ادا کرکے وہ پھر اجلاس کی صدارت کے لیے واپس چلے گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ پرووائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع (مرحوم) سنایا کرتے تھے۔ طلباء یونین کا افتتاحی جلسہ تھا اور ہیم وتی نندن بہوگنا (وزیر اعلیٰ، اتر پردیش) مہمان خصوصی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے۔ انجینئرنگ کے طلبا نے اسی روز سے بھوک ہڑتال کا نوٹس دے رکھا تھا۔ ماحول میں کافی تناؤ تھا۔ جلسہ ختم ہونے پر خسرو صاحب نے شفیع صاحب کو وی سی لاج آنے کو کہا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ خسرو صاحب دو بڑے سوٹ کیس منگانے کی بات کر رہے ہیں۔ پوچھنے پر بتانے لگے کہ سعودی عرب میں اقتصادیات کے موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی ہے، اس میں شریک ہونا ہے۔ شفیع صاحب نے یاد دلایا کہ لڑکے تو بڑے پیمانے پر بھوک ہڑتال کی تیاری میں لگے ہیں۔ خسرو صاحب اطمینان سے بولے ”اسے آپ دیکھ لیجیے گا۔“ اور ایک گھنٹہ بعد موصوف دہلی ایرپورٹ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔[۷]

خسرو صاحب کے زمانے تک یونیورسٹی میں کوچنگ اور گائیڈنس سینٹر کا قیام نہیں ہو پایا تھا تاہم ہر سال پانچ سات طلبا سِول سروِسز کے امتحان میں کامیاب ہو جاتے تھے اور ایک سال تو سولہ امیدوار منتخب ہوئے۔ ان امتحانات میں شرکت کی تیاری کرنے والوں کو خسرو صاحب معاشیات پڑھاتے تھے اور انٹرویو کی تیاری کراتے تھے۔ خواجہ محمد شاہد صاحب فرماتے ہیں کہ ایسے ہی ایک لیکچر کے لیے ایک شام ہم لوگ خسرو صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ خبر آئی کہ طلبا کا کوئی معاملہ آن پھنسا ہے جس کے سلجھانے میں خسرو صاحب الجھے ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے کہلوایا ہے کہ تھوڑا انتظار کریں۔ جب انتظار کرتے کرتے رات کے دس بج گئے تو ہم لوگوں نے اگلے دن آنے کا وعدہ کرتے ہوئے اجازت چاہی لیکن خسرو صاحب کا حکم ہوا کہ ہم سب طلبا پرووائس چانسلر کے آفس پہنچیں جہاں اس وقت وہ موجود تھے۔ وہاں پہونچے تو موصوف طلبا کے جم گھٹ سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گئے اور Inflation کے عنوان پر لیکچر دیا جو رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک چلا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ پھر برابر کے کمرے میں تشریف لے گئے جہاں طلبا کے نمائندے ان کے منتظر تھے۔[۹]

خسرو صاحب ہجوم کا سامنا کرنے سے کبھی نہیں کتراتے تھے۔ ان کی ڈکشنری میں خوف، جھجھک، گھبراہٹ اور مایوسی جیسے الفاظ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ کئی بار انہوں نے محض اپنی فہم و ذکا اور جولانئ طبع کے سہارے بپھرے ہوئے احتجاجی ہجوم کو منٹوں میں رام کر لیا۔ ان کا طریقۂ کار یہ ہوتا تھا کہ وہ شکایتوں اور مطالبات کو بڑے غور سے سنتے تھے پھر اپنا موقف سمجھاتے تھے اور ڈائیلاگ کے ذریعے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے تھے، کبھی کبھی تو وہ خود احتجاج کاروں کے مطالبات کی وکالت کرنے لگتے تھے جس سے فطری طور پر مظاہرین کے لب و لہجہ میں نرمی آجاتی تھی اور گفت و شنید کی راہ ہموار ہو جاتی تھی۔ اور گفتگو میں بھلا خسرو صاحب سے کون جیت سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ریسرچ اسکالرز کے چند مطالبات لے کر ڈاکٹر انور ظہیر امانی (جو شاید ان دنوں اے ایم یو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے) کی قیادت میں ایک وفد خسرو صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس میں احقر بھی شامل تھا۔ امانی بھائی (مرحوم) اپنی انگریزی کی استعداد کے لیے کافی مشہور تھے۔ موصوف کی لکھی ہوئی عرضداشت جب خسرو صاحب کے سامنے رکھی گئی تو پہلے تو انہوں نے طرز نگارش کی جم کر تعریف کی، پھر بولے۔ ”دوستو! اس کو مزید زوردار بنایا جا سکتا ہے۔ جب بات کہی جائے تو کیوں نہ پوری قوت سے کہی جائے۔“ انہوں نے اپنے اسٹینو گرافر کو طلب کیا اور پوری عبارت از سر نو لکھوا دی۔ جب تک نیا متن ٹائپ ہو کر آیا، خسرو صاحب نے عرضی نویسی کے فن پر ایک مختصر سی تقریر بھی کر ڈالی۔ نیا ڈرافٹ پڑھ کر اس میں مزید کچھ تصحیح کی اور بولے ”اب بات میں مزہ آ گیا ہے، دیکھتے ہیں انتظامیہ کیسے بچ کر نکلتا ہے۔“ ہم لوگ یہی سوچتے رہ گئے کہ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے خسرو صاحب فریق مخالف ہیں یا ہمارے اپنے وکیل ہیں؟ اس طرح موصوف نے اپنی ہی لکھوائی ہوئی درخواست کو ہماری جانب سے قبول کر کے ہم سے اجازت مانگ لی، اور وفد کے اراکین سوچتے ہی رہ گئے کہ دل کی بھڑاس کیسے نکالیں۔ پیچیدہ حالات سے نپٹنے کا یہ تھا وہ خسروی انداز جو نہ صرف خسرو صاحب کی ذہانت کو ظاہر کرتا تھا بلکہ ان کی خود اعتمادی کا بھی غمّاز تھا۔

اللہ بخشے مرحوم کو، امانی بھائی کا ذکر آیا تو یہ بتا تا چلوں کہ وہ شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر خالد ظہیر امانی کے چھوٹے بھائی اور شعبہ نباتات کے پروفیسر اے کے ایم غوث کے شاگرد رشید تھے۔ اس بات کا علم محض چند ہی لوگوں کو ہے کہ موصوف کی انگریزی کی لیاقت ایک انتہائی نازک موقع پر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے حق میں بڑی مہنگی ثابت ہوئی۔ سید حامد صاحب کے دور اقتدار میں جب پروفیسر عرفان حبیب صاحب کے اخباری بیان کو لے کر طلبا برادری میں اشتعال پھیلا اور ہنگاموں کی ابتدا ہوئی، اس وقت عرفان اللہ خاں اسٹوڈنٹس یونین کے صدر تھے اور انور ظہیر امانی ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے، احتجاجیوں اور انتظامیہ کے درمیان سفارت کاری اور پس پردہ بات چیت کے نتیجے میں وائس چانسلر آفس سے ایک نوٹ صدر یونین کو بھیجا گیا جس میں یقین دلایا گیا کہ اگر طلبا اپنا احتجاجی پروگرام ختم کر دیں تو پھر عرفان حبیب صاحب کو اقتدار سے بے دخل کر کے ان کے متنازعہ بیان کے بارے میں تفتیش کرا دی جائے گی۔ یہ تحریر جب امانی بھائی کو دکھائی گئی تو انہوں نے ایک فقرہ کی ساخت پر اعتراض کیا اور مشورہ دیا کہ اس میں ”may“ کی جگہ ”shall“ ہونا چاہئے تبھی یہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ وائس چانسلر صاحب اس پر راضی نہ ہوئے، ان کا کہنا تھا کہ دفتری زبان میں ”may“ کا مطلب ”shall“ ہی لیا جائے گا۔ یہ محض تحریر کا ایک اسلوب ہے جو اپنی جگہ مناسب اور صحیح ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں خیموں میں زبان دانی کا زعم اور ذاتی انا قدر مشترک بن گئے۔ لہٰذا کوئی بھی فریق جھکنے کو تیار نہیں ہوا اور پھر جو کمانیں تنیں اور اعلان جنگ ہوا، تو اس لاحاصل نبرد آزمائی کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا گیا اور اسکا آخری سرا برسوں تک کسی کو نظر نہیں آیا۔

خیر بات چل رہی تھی خسرو صاحب کے حوصلے اور اعتماد کی، اس ضمن میں دو واقعات بہت مشہور ہوئے۔ یونیورسٹی ایکزیکٹیو کونسل کی ایک میٹنگ کے دوران خبر آئی کہ شمشاد مارکیٹ میں ہزاروں کی تعداد میں طلبا جمع ہیں۔ ایک ٹرک سے کسی ساتھی کے کچل جانے پر احتجاجی ہجوم نے ٹرک کو آگ لگا دی ہے۔ دوکاندار خوف زدہ ہیں۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولس سپرنٹنڈنٹ مسلح پولس کا دستہ لے کر جائے حادثہ پر پہنچ گئے ہیں۔ صورت حال دھماکہ خیز ہے اور ضلع افسران کا خیال ہے کہ اس وقت وائس چانسلر کا وہاں پہونچنا ضروری ہے۔ ورنہ حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔ خسرو صاحب فوراً شمشاد مارکیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ مشتعل ہجوم اور مسلح پولس کے مابین زبردست تناؤ کی فضا بن چکی تھی، خسرو صاحب شور و شغب کے ماحول پر قابو پانے کے لیے پولس کا لاؤڈ اسپیکر لے کر ایک بس کی چھت پر چڑھ گئے اور مجمع کو سمجھانے لگے، خادم اس ہجوم میں موجود تھا، خسرو صاحب نے بات یہاں سے شروع کی کہ طلبائے عزیز، تم نے جو کچھ بھی کیا وہ قطعی درست کیا۔ ٹرکوں کی تیز رفتاری اور ڈرائیوروں کی لاپرواہی سے اگر راہ گیر مارے جائیں گے تو فطری طور پر ہمارا ردعمل یہی ہوگا، بلکہ اس سے بھی شدید ہو سکتا ہے، میں تمہارے احتجاج میں برابر کا شریک ہوں۔ وائس چانسلر کی زبان سے خلاف امید اس طرح کے حمایتی کلمات سن کر طلبا کو اطمینان ہوا اور کسی جانب سے خسرو صاحب زندہ باد کے نعرے

بھی بلند ہونے لگے،لوہا گرم دیکھ کرخسرو صاحب نے ایک اور ضرب لگائی اور فرمایا ''پولس کے مسلح دستوں نے تمہاری طرف رائفلیں تان رکھی ہیں مگر یقین رکھو،کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو بات بہت آگے تک جائے گی۔ ضلع انتظامیہ سے نپٹنا میرا کام ہے،تم میرا کہا مانتے ہوئے صرف اتنا کرو کہ کچھ وقت کیلئے یہاں سے دُور ہٹ جاؤ۔مصلحت کا یہی تقاضہ ہے اور یہ ہمارے وقار کا بھی مسئلہ ہے،......وغیرہ وغیرہ''انجام کار محض آدھے گھنٹے میں ہزاروں کا مجمع منتشر ہو چکا تھا۔سبھی نے اطمینان کا سانس لیا اور پولس افسران بھی خسرو صاحب کی ذہانت وجسارت کے قائل ہوگئے۔

خسرو صاحب ایک ماہر نفسیات بھی تھے،کشیدہ فضا اور غم و غصے کے ماحول میں وہ کوئی ایسی حرکت کردیتے تھے جس سے مجمع کی توجہ بنیادی مسئلے سے ہٹ جاتی تھی، پھر جوش سرد ہو جانے پر ڈائیلاگ کی گنجائش نکل آتی تھی اور اس میدان کے تو وہ بہر حال جانے مانے شہسوار تھے ہی۔ یہ حقیقت ہے کہ خسرو صاحب کی نرم روی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے دور میں دھرنے اور مظاہرے بہت عام ہوگئے تھے۔ایسے ہی ایک موقع پر طلبا کا ہجوم یونین ہال پر جمع ہوا۔ جوشیلی تقریروں سے گھنٹوں نوجوان خون کو گرمایا گیا۔ حالانکہ طلبا کے نمائندہ وفد سے ملنے کے لیے خسرو صاحب وکٹوریہ گیٹ کے وی۔سی آفس میں موجود تھے۔ مگر طلبا کی ضد ہوئی کہ وائس چانسلر یونین آفس آکر ہی ان کی بات سنیں۔طلبا کی نگاہیں مسلسل وائس چانسلر کی کار پر لگی ہوئی تھیں مگر وہاں حرکت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بڑی دیر بعد یہ واضح ہوسکا کہ ایک سائیکل سوار جو وکٹوریہ گیٹ سے فیض گیٹ کی جانب آرہا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ شیخ الجامعہ علی محمد خسرو ہیں جو اپنی دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ جھوم جھوم کر ایک اسپورٹ بائیک چلاتے ہوئے آرہے ہیں۔ پھر وہ ہوا جس کی کوئی خواب میں بھی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ہجوم کے قریب پہنچ کر خسرو صاحب نے سائیکل کا اگلا پہیہ اوپر اٹھالیا اور کچھ لمحات محض پچھلے پہیے پر سائیکل چلائی۔ وائس چانسلر کا اکیلے سائیکل چلاتے ہوئے آجانا ہی لوگوں کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا، پھر اوپر سے یہ کرتب بازی، گویا سونے پر سہاگہ۔لہٰذا تالیاں بج گئیں، سبھی لوگ محو حیرت تھے، کچھ ہنس رہے تھے، کچھ ان کی قصیدہ خوانی کرنے لگے تھے۔قصہ مختصر یہ کہ لاشعوری طور پر غم وغصے کا ماحول زائل ہو چکا تھا اور اس طرح چند سیکنڈ میں ہی موصوف نے طلباء لیڈروں کی گھنٹوں کی محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔

خسرو صاحب کی مدت منصبی پوری ہونے لگی تو ریسرچ اسکالرز نے اپنی ایسوسی ایشن کے دفتر میں ان کو مدعو کیا۔ اور چائے پانی کا اہتمام ہوا۔لوگوں نے فرمائش کی کہ کچھ آپ بیتی سنائیں تو خسرو صاحب نے اپنے قیام انگلستان کے کئی دلچسپ واقعات بیان کرڈالے۔ ایام جوانی کو یاد کرکے وہ پوری طرح موڈ میں آچکے تھے،فرنگی حُسن سے متاثر ہوکر خود موصوف نے ان دنوں جو اشعار کہے تھے وہ بھی سنائے۔ انگلی پکڑ کر پہونچا پکڑ لینا تو طلبا کی عادت کا ایک حصّہ ہے،لہٰذا کچھ لوگوں نے ترنم سے سنانے کی فرمائش کرڈالی اور موصوف نے مایوس بھی نہیں کیا،نہ صرف اردو بلکہ انگریزی کی نظمیں بھی خوب لہک لہک کر سنائیں۔

علیگڑھ میں خسرو صاحب کی اوّلین آمد کا قصہ بھی بہت خوب تھا۔فرماتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی میں ریڈرشِپ کے لئے انٹرویو دینے علیگڑھ آیا تو پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب (مرحوم) کے گھر پر قیام رہا۔ پروفیسر صاحب مجھے اسٹیشن سے لے کر گھر پہونچے اور دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بلند آواز سے 'دختر' کو پکارا۔لیکن اندر سے کسی لڑکے نے آکر دروازہ کھولدیا۔ پھر کھانے کی میز پر انہوں نے کئی بار دختر کو آواز دی مگر ہر بار وہی لڑکا سامنے آیا۔کچھ دیر بعد موصوف نے آواز لگائی ''دختر' چائے لے آؤ''۔ چائے کی ٹرے کے ساتھ پھر وہی شکل دکھائی دی۔ نوجوان خسرو کی نگاہوں کے تجسّس کو پروفیسر صاحب بھانپ گئے اور ملازم کی جانب اشارہ کرکے بتلایا کہ یہ دو بھائی ہیں،ان کے والدین ناخواندہ تھے،انہوں نے دو ہم وزن نام تلاش کرکے ایک بیٹے کا نام اختر رکھدیا تھا اور دوسرے کا دُختر' یہ وہی دوسرا بیٹا ہے۔ [۲]

زبان وکلام کے دھنی،خسرو صاحب کو راقم نے صرف ایک بار دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ وہ موقع تھا جب محمد اعظم خاں (اس وقت کے طلبا یونین کے سکریٹری' جو بعد میں کئی مرتبہ اتّر پردیش حکومت میں وزیر رہے) ایمرجنسی کی قید وبند کے مصائب جھیل کر رہا ہوئے تھے اور یونیورسٹی میں کینیڈی ہال کے اسٹیج سے انہوں نے طلبا کو خطاب کیا تھا۔اس جذباتی ماحول میں اعظم بھائی کی شعلہ بیانی نے یقیناً سامعین کو بہت متاثر کیا تھا اور خسرو صاحب کی بے بسی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ان کی تقریر پر اس روز زبردست ہوٹنگ بھی ہوئی تھی۔دراصل اعظم بھائی کی گرفتاری کے سلسلے میں خسرو صاحب کا کردار قدرے مشکوک اور ناپسندیدہ رہا تھا۔یہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا اور شاید حکومت وقت کے زبردست دباؤ کے آگے خسرو صاحب کو ہتھیار ڈال دینے پڑے تھے۔ چونکہ اعظم بھائی کو وائس چانسلر لاج میں بُلا کر پولس کے حوالے کردیا گیا تھا، لہٰذا طلبا برادری میں زبردست ناراضگی تھی۔ پھر جب اعظم خاں صاحب جیل سے باہر آئے تو پورے علیگڑھ کے ہیرو بن گئے۔ اپنی لفّاظی اور تندخوئی کے لیے تو اعظم بھائی زمانۂ طالب علمی میں بھی مشہور تھے،مگر سنتے ہیں کہ اتر پردیش حکومت میں کابینی وزیر بن جانے کے بعد ان کی ذاتی صفات میں رعونت اور بداخلاقی کا مزید اضافہ ہوگیا تھا (یہ محض میڈیا کا پروپیگنڈا بھی ہوسکتا ہے) ۔قیام ہوسٹل کے دوران احقر کی اعظم بھائی سے بہت اچھی بنتی تھی۔ ایک آدھ بار ان کی تقریر کا ڈھانچہ بھی تیار کرنا پڑا تھا۔ بلاشبہ وہ اس دور کے ایک آتش نوا مقرر تھے اور انتہائی بے باک اسٹوڈنٹ لیڈر مانے جاتے تھے۔خداوند کریم اعظم بھائی کے اچھے دن تاحیات برقرار رکھے، مشاہدین کا خیال یہ ہے کہ موصوف جب اڑان بھرتے ہیں تو پھر پلٹ کر دھرتی کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہیں۔

تقریباً پندرہ برس پہلے لکھنؤ کے متوطن میرے ایک شناسا' شکیل احمد صاحب' دلّی تشریف لائے، بولے کہ'' بیٹے کے لیے چپراسی کی ملازمت کے سلسلے میں اعظم خاں صاحب (وزیر محنت و اوقاف ،اتر پردیش) سے ملنا چاہتا ہوں۔ سنا ہے آپکی موصوف سے پرانی شناسائی ہے، ایک خط لکھ دیں تو میں آپ کے حوالے سے موصوف سے ملاقات کرلوں''۔ مجھے تھوڑا تامّل ہوا، چوں کہ برسوں سے اعظم بھائی سے کوئی ربط وضبط نہیں رہ گیا تھا،لہٰذا خدشہ تھا مبادا پرانے مناظر پر وقت کی گرد جم جانے کے باعث چشم تصوّر سے احقر کو دیکھنے اور پہچاننے میں اعظم بھائی کو دشواری ہو۔ بہرکیف بہت اصرار کرنے پر میں نے صرف یہ لکھدیا کہ اعظم بھائی' ممکن ہو تو حامل رقعہ کی بات سن لیجیے۔ یہ دو سطری رقعہ لے کر شکیل صاحب جب منترالیہ پہنچے تو اعظم بھائی نے ان کی بات بڑی توجہ سے سنی' تواضع بھی کی اور یہ وضاحت فرمائی کہ'' اقبال میاں تو جانتے ہیں' میں ایک اصول پسند انسان ہوں اور سفارشات میں یقین نہیں رکھتا ہوں''۔ بات چونکہ اصول کی تھی، ہمیں بھی اچھی لگی۔ چند مہینوں بعد جامعہ ہمدرد میں داخلوں کا دور شروع ہوا۔ میں ان دنوں وہاں پر امور داخلہ کا انچارج تھا۔ وائس چانسلر جامعہ ہمدرد (پروفیسر رشید الظفر مرحوم) نے داخلوں کے سلسلے میں موصول ہونے والے کچھ خطوط کی فائل مجھے بھجوائی۔ یہ دیکھ کر بہر حال حیرت ہوئی کہ اس میں ایک خط اعظم بھائی کا بھی تھا، جس میں فارمیسی کے ایک کورس میں داخلے کے لیے کسی امیدوار کی سفارش کی گئی تھی۔

وائس چانسلر بننے سے پہلے خسرو صاحب کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔لیکن انہوں نے علیگ برادری سے والہانہ لگاؤ اور بے پناہ اپنائیت کا اظہار کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ'' سرسیدؒ بھی تو اس یونیورسٹی کے نہ کبھی طالب علم رہے نہ استاد۔ مگر کیا انہیں علیگ برادری سے الگ کیا جاسکتا ہے؟ میرا تعلق بھی علی گڑھ سے کچھ اسی طرح کا بن گیا ہے''۔ فرماتے تھے۔'' یہ علیگ برادری بھی عجیب برادری ہے، دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جاؤ یہ وہاں موجود ملے گی، میکسیکو اور برازیل جیسے دُور دراز ممالک میں بھی یونیورسٹی کے اولڈ بوائز نے میرا خیر مقدم کیا، مجھ سے کہیں زیادہ عمر والے حضرات نے بھی جب یہ کہا کہ ہم آپکے ادنیٰ طالب علم اور آپ ہمارے محترم وائس چانسلر ہیں تو یہ سن کر میرا دل بھر آیا۔''

غالباً ۱۹۷۹ کا پولیس ایکشن تھا۔ دادری میں یونیورسٹی طلباء

کی منصوبہ بند پٹائی اور لوٹ مار کے بعد یونیورسٹی کیمپس میں زبردست انتشار پھیل گیا تھا اور حسب روایت پولس نے نہتے طلبا پر تھری ناٹ تھری کا نشانہ باندھنے میں کافی پھرتی اور مستعدی کا مظاہرہ کیا تھا۔ رات بھر افراتفری کا عالم رہا۔ پولس کی گولیوں سے زخمی ہو ہو کر طلباء میڈیکل کالج کے اسپتال میں بھرتی ہوتے رہے۔ میڈیکل کالج کو نسبتاً محفوظ مقام سمجھتے ہوئے ہم بھی سلیمان ہال سے بھاگ کر ہادی حسن ہال چلے گئے تھے۔ آنکھوں آنکھوں میں رات گزر گئی۔ فائرنگ کی دہشت ناک آوازوں سے رات بھر در و دیوار گونجتے رہے۔ جیسے ہی صبح کی سفیدی نمودار ہوئی، خسرو صاحب ہادی حسن ہال آ پہنچے، وہ اسی رات دلّی سے علی گڑھ پہنچے تھے، پاؤں میں چپّل، بال بکھرے ہوئے، ہاتھ میں بیڑی کا بنڈل، چہرے پہ تکان اور تفکر کے آثار۔ طلبا کی ڈھارس بندھاتے ہوئے وہ رات بھر اقامتی ہالوں، ہوسٹلوں اور اسپتال کا دورہ کرتے رہے تھے۔ انہوں نے ہوسٹل انتظامیہ کو ہدایت دی کہ تمام طلبا کے لیے چائے پانی کا انتظام کریں۔ اور طلباء سے کہا کہ فوراً اپنے گھروں کے لئے رختِ سفر باندھ لیں۔ کیونکہ یونیورسٹی بند کر دی گئی ہے اور آج سارے ہوسٹل خالی کرا لیے جائیں گے۔

خسرو صاحب چونکہ خود ایک صاف وشفّاف طبیعت اور نیک مزاج کے حامل تھے، وہ دوسروں کو بھی نیک دل اور دیانتدار ہی سمجھتے تھے، انجینئرنگ کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر محمد یٰسین انصاری صاحب بتلاتے ہیں کہ پٹرولیم انسٹی ٹیوٹ کے سلسلے میں کچھ خطوط خسرو صاحب کے دستخط سے بھیجے جانے تھے۔ خسرو صاحب عجلت میں تھے لہٰذا وائس چانسلر کے لیٹر پیڈ کے ایک درجن سادہ اوراق پر دستخط کر کے انصاری صاحب کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ وقت کم ہے، خط کے متن کو ان پر ٹائپ کرا کے فوراً روانہ کر دیجئے۔ خطوط بھیج دیے گئے، خسرو صاحب کے دستخط شدہ چند اوراق جو بچ گئے تھے انہیں واپس کرنے کے لیے انصاری صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ نے تو بلا تکلف بہت سے سادہ اوراق پر دستخط کر دیئے تھے، مگر ایسے اوراق کا بے جا استعمال بھی ہوسکتا ہے، جواب میں خسرو صاحب نے فرمایا ''اس یونیورسٹی میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔'' [۸]

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں خسرو صاحب نے کئی ناقابل یقین کام کر دکھائے۔ یو جی سی کی اجازت کے بغیر فورتھ گریڈ عملے کی تنخواہوں میں از خود اضافہ کر دینا اور پھر وزارت تعلیم اور یو جی سی کے روبرو اپنے فیصلے کے جواز میں مستقل وکالت کر کے آخر کار حکومت وقت کی منظوری حاصل کر لینا ان ہی کے بس کی بات تھی۔ میڈیکل کورس کی سیٹوں میں اضافے کا فیصلہ بھی موصوف کے احسن فیصلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ زید بن سلطان النہیان کو خصوصی طور پر مدعو کر کے ان سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں پیٹرولیم انجینئرنگ کے انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور اس کے تمام اخراجات کی ادائیگی کے لیے سلطان کی جانب سے منظوری حاصل کر لینا خسرو صاحب کا ایک عظیم کارنامہ تھا۔ گو حکومت ہند کی متعلقہ وزارتوں کی جانب سے اس منصوبہ کی تکمیل میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں جن کی وجہ سے کام میں بے حد تاخیر ہوئی اور پلان میں تخفیف بھی۔ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی بدنام زمانہ دفعہ C (3) 19 جو وائس چانسلر کو ایمرجنسی میں از خود فیصلے لینے اور انہیں نافذ کرنے کا اختیار دیتی ہے، خسرو صاحب کے دورِ اقتدار میں سرد خانے میں پڑی رہی۔ شاید اس دفعہ کا سب سے کم استعمال انہی کے دورِ اقتدار میں ہوا۔ یونیورسٹی ایکٹ کے سلسلے میں چلنے والی تحریک میں بھی آپ کا کردار بڑا اہم تھا۔ آپ نے اساتذہ، طلباء، غیر تدریسی عملہ اور ابنائے قدیم پر مشتمل ایک چالیس رکنی کمیٹی تشکیل کی اور اپنی صدارت میں اس کمیٹی کی آٹھ میٹنگیں کر کے سال بھر کے اندر اندر ایک مسودہ کو مکمل کیا اور مسز گاندھی کو بھیج دیا تا کہ وہ اس کو پارلیامنٹ میں پاس کرا کے ڈاکٹر نور الحسن والے ایکٹ کا متبادل ایکٹ بنا دیں۔ سوئے اتفاق سے اسی اثناء میں مسز گاندھی کو وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونا پڑا، اور خسرو صاحب کی تمام کوششوں پر اچانک اوس پڑ گئی۔ جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں انہوں نے پھر ایک سترہ نفری وفد بنا کر دلّی بھیجا۔ وفد نے اس وقت کے جنتا پارٹی کے صدر (شری چندر شیکھر)، مرکزی وزیر تعلیم (شری پرتاپ چندر) اور وزیر قانون (شری شانتی بھوشن) وغیرہ سے ملاقات کر کے انہیں قائل کیا کہ مجوزہ بل نافذہ بل سے بدرجہا بہتر ہے۔ انجام کار لوک سبھا میں تو یہ بل پاس بھی کرا لیا گیا تھا مگر راجیہ سبھا سے منظوری نہ پاسکا۔ [۳]

خسرو صاحب لوگوں کے مطالبات کو حتی الوسع منظوری دینے میں فیاض تھے۔ ان کی اس عادت نے ایک لطیفے کو جنم دیا جو کیمپس میں بہت مشہور ہوا۔ انجینئرنگ کالج کے طلبا کے ایک گروپ نے خسرو صاحب سے ملاقات کی اور امتحان کی تاریخیں آگے بڑھانے کی درخواست کی کیوں کہ کئی پیپرز کا نصاب ابھی ختم ہونا باقی تھا۔ خسرو صاحب نے توجہ سے تمام بات سن کر انکی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا ''تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔'' کچھ دیر بعد مخالف گروپ آن پہنچا اس نے کہا کہ امتحانات کو موخر کیا گیا تو جو لوگ یو پی ایس سی کے امتحانات میں شریک ہونا چاہتے ہیں انہیں موقع نہ مل سکے گا۔ لہٰذا امتحانات اعلان شدہ اسکیم کے تحت ہی کرائے جائیں۔ اگر کسی پیپر میں کوئی موضوع پڑھائے جانے سے رہ بھی گیا ہے تو اسے خود تیار کیا جاسکتا ہے۔ خسرو صاحب نے اس بات سے بھی اتفاق کیا اور فرمایا ''تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔'' بیگم طیّبہ خسرو نے یہ تمام گفتگو سنی تھی، طلبا کے جانے کے بعد وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے خسرو صاحب سے بولیں کہ آپ نے پہلے گروپ سے بھی اتفاق کیا اور کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں اور پھر دوسرے گروپ سے بھی یہی کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں، جب کہ دونوں کے نظریات اور مطالبات ایک دوسرے کے قطعی برعکس تھے۔ خسرو صاحب نے برجستہ فرمایا ''آپ بھی ٹھیک کہتی ہیں۔''

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا بھی حاضر جوابی اور لفاظی میں انتہائی طاق مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے خسرو جیسے ماہر فنکار کو بھی نہیں بخشا۔ ایک تقریب میں خسرو صاحب کو حضرت امیر خسروؒ سے تشبیہ دی گئی۔ جواب میں خسرو صاحب نے کہا کہ میں امیر خسرو نہیں بلکہ غریب خسرو ہوں۔ غریب الوطنی کے عالم میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں۔ ایک طالب علم لیڈر نے اپنی تقریر میں کہا ''لوگ کہتے ہیں کہ آپ امیر خسرو ہیں، آپ کہتے ہیں میں غریب خسرو ہوں، میں کہتا ہوں کہ آپ نہ امیر خسرو ہیں، نہ غریب خسرو ہیں، بلکہ اک عجیب خسرو ہیں۔'' خسرو صاحب اس برجستہ ریمارک سے بہت محظوظ ہوئے۔

افسوس کہ خسرو جیسی لائق، فعال اور سدا بہار شخصیت کی بھی علی گڑھ نے قدر نہ کی۔ آخری ایّام میں شدید مخالفت ہوئی۔ لہٰذا واپسی شایانِ شان نہ ہوسکی۔ ویسے بھی علی گڑھ میں وائس چانسلروں کی آمد پر تعظیم و تکریم اور واپسی پر تذلیل و توہین کی ایک روایت سی بن گئی ہے۔ میں نے اب تک جتنے شیوخ الجامعہ کا دور دیکھا ان میں غالباً عبدالعلیم صاحب اور سید ہاشم علی صاحب ہی ایسے خوش نصیب تھے جو عزت کے ساتھ علی گڑھ چھوڑ پائے ورنہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کی داستان کم وبیش یکساں رہی۔ علی یاور جنگ صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کا تو ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ خسرو صاحب اور سید حامد صاحب کی واپسی بھی بے حد مکدّر فضا میں ہوئی، حامد انصاری صاحب کا زمانہ اتنا مختصر تھا کہ ظہرانے عصرانے میں ہی شام ہو گئی۔ نسیم فاروقی، محمود الرحمان اور نسیم احمد صاحبان کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ غرضیکہ ماہر تعلیم ہو یا بیورو کریٹ، سائنسداں ہو یا سفارت کار، گلشن سر سید میں سبھی ناکام قرار دیے گئے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ بعض وائس چانسلر حضرات خود کو ایک مطلق العنان بادشاہ سمجھ بیٹھتے ہیں اور اصول وضوابط کو بالائے طاق رکھ کر بے انصافی، ظلم و زیادتی اور بدعنوانی پر اُتر آتے ہیں، جسکی مخالفت ہونا ایک فطری بات ہے۔ حالانکہ دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بیشتر مفاد پرست اور بزدل اساتذہ اور غیر تدریسی ملازمین چار سال تک تو خاموش تماشائی بنے رہنا ہی پسند کرتے ہیں، ہاں پانچویں برس ضرور انکی مجاہدانہ جسارت عود کر آتی ہے اور دلوں میں بھرا غبار اچانک باہر نکل کر پورے کیمپس میں پھیل جاتا ہے۔ جب اجتماعی طور پر آواز بلند ہوتی ہے تو بسا اوقات اسکا نوٹس بھی لیا جاتا ہے۔ کئی صاحبان یونیورسٹی چھوڑنے سے قبل ہی تفتیشی ایجنسیوں کے لپیٹے میں آ گئے تھے۔ کسی ادارے کا سربراہ ہی قانون شکنی پر اتر آئے تو پورے عملے پر بے دلی، مایوسی

اور جھلاّ ہٹ کا طاری ہونا فطری اور یقینی ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہوا جب مسلم یونیورسٹی کے ایک ذہین استاد اور صاحب طرز مصنف نے یہ کہا ''اگر کوئی وائس چانسلر ایمانداری کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص بیک وقت وائس چانسلر بھی ہو اور ایماندار بھی۔'' موصوف کا یہ قول یقیناً مایوس کن حالات کے تئیں انکے بے پناہ غم و غصّے کا مظہر تھا۔

علیگڑھ سے وداع ہونے کے بعد بھی یونیورسٹی کے ہوشمند حلقوں میں خسرو صاحب کی مقبولیت بنی رہی تھی، وہ اکیلے ایسے وائس چانسلر ہیں جو بعد میں یونیورسٹی کے چانسلر بھی بنائے گئے' اور اگر حکیم عبدالحمیدؒ کا نام سامنے نہ آیا ہوتا تو شاید وہ دوسری بار بھی منتخب کیے جاتے۔ خسرو صاحب کو علیگڑھ سے گئے ہوئے ابھی چند ہفتے ہی گذرے تھے کہ ایک روز خبر اڑی کہ موصوف کو یونیورسٹی کیمپس کے اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں دیکھا گیا ہے۔ مختلف شعبوں کے متعدد طلباء فوراً بینک کی طرف دوڑے مگر دیدار سے محروم رہے کیونکہ موصوف وہاں سے جا چکے تھے۔ پتہ چلا کہ انکے لنچ کا انتظام پروفیسر خواجہ شمیم احمد صاحب کے گھر پر ہو رہا ہے۔ بلا کسی تکلف کے بہت سے لوگ خواجہ صاحب کے گھر پہ جا دھمکے۔ کہلوایا گیا کہ کچھ طلبا ملنے آئے ہیں۔ خسرو صاحب فوراً باہر آئے اور ایسے تپاک سے ملے جیسے سب سے انکی بڑی قریبی شناسائی رہی ہو، حالانکہ ان میں سے شاید کوئی بھی طالب علم ایسا معروف نہیں تھا جسے وہ واقعی پہچانتے ہوں گے۔ موصوف نے فوراً کمرہ کھلوایا' شربت پلوایا' حال چال پوچھا اور کچھ خوبصورت مشورے دیئے اسی دوران اندر سے کھانے کا تقاضہ آ گیا تو خسرو صاحب نے انسے فرمایا ''بھئی دیکھیے' آپ کو ابھی پورے دو منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔ ہم ذرا دوستوں سے بات کر رہے ہیں۔'' اسطرح طلبا کی عزت افزائی بھی فرمادی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی گوش گذار کر دیا کہ بس دو منٹ کے اندر اندر پھوٹ لو۔ تو یہ تھا خسرو صاحب کا انداز تکلم۔ کتنا شائستہ اور کیسا دو ٹوک!![۱۰]

پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ ہمدرد (دہلی) آجانے پر احقر کو پھر سے خسرو صاحب کی زیارت کے مواقع نصیب ہوئے۔ حکیم صاحب جب حیات تھے تو دلّی میں علمی اور ملی موضوعات پر مذاکرات کیلئے جامعہ ہمدرد کو ایک امتیازی مقام حاصل تھا۔ ایسے پروگراموں میں خسرو صاحب کی شرکت بھی ہوتی رہتی تھی۔ دراصل حکیم صاحب مرحوم (حکیم عبدالحمید، بانیٔ جامعہ ہمدرد) کو کھلانے پلانے کا بڑا شوق تھا۔ انکے ڈنر کی محفلوں میں جو رنگ جمتا تھا اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ علی محمد خسرو، سید حامد، اخلاق الرحمان قدوائی، اے ایس پینٹل، مالک رام، خواجہ حسن ثانی نظامی، سروپ سنگھ، رشید الدین خاں، ایس ایم ایچ برنی، مونس رضا، اور گلزار زتشی جیسے علم و ادب کے شہسوار حکیم صاحب کے نورتنوں میں شامل تھے۔ بسا اوقات جامعہ ہمدرد کے چانسلر لاج میں ڈنر کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں اندر باہر کے بہت سے مہمانوں کی شرکت ہوتی تھی۔ میزبانی کے فرائض عام طور پر حکیم صاحب کے معتمد خاص، سید اوصاف علی صاحب نبھاتے تھے۔ بالائی منزل پر واقع اپنے کمرے سے آٹھ بجے حکیم صاحب نیچے اترتے تھے اور مہمانوں کی مزاج پرسی کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آجاتے تھے۔ کھاتے تو وہ برائے نام ہی تھے، بس مہمانوں کی دل جوئی اور تبادلۂ خیال مقصود ہوتا تھا۔ کھانے کے دس پانچ منٹ بعد ہی وہ اجازت طلب کر لیتے تھے لیکن بقیہ لوگوں کی محفل اکثر اوقات جمی رہتی تھی۔ ایک بار ڈنر کے بعد خسرو صاحب زبردست موڈ میں آ گئے۔ ایسے پر لطف واقعات اور لطیفے سنائے کہ حکیم صاحب بھی اپنے معمولات کی پابندی بھول گئے۔ اشعار سنائے بغیر تو خسرو صاحب کا کھانا ہضم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس دن یہ طے پایا کہ محض مزاحیہ اشعار چلیں گے، اور پھر جو وہ شروع ہوئے تو لوگوں نے اپنے پیٹ پکڑ لیے۔ تقریباً گیارہ بجے تک محفل قہقہہ زار رہی۔ جب انسے کہا گیا کہ کوئی بے تکا شعر مرحمت فرمائیں تو برجستہ فرمایا:

ایسے ویسے' کیسے کیسے ہوگئے !!
اور کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگئے

غالباً ہزاروں اشعار، سینکڑوں حکایات و واقعات اور درجنوں نظمیں اور غزلیں خسرو صاحب کے ذہن میں لفظ بہ لفظ محفوظ تھے۔ یہ شعر جو حقیقتاً انکے طرز عمل کا آئینہ دار تھا' اکثر انکی زبان پر رہتا تھا:

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ شجر پہ بار نہ ہو

خسرو صاحب کے فکر و عمل کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ان کی نگاہیں عوامی مسائل اور باہمی رواداری پر مرکوز رہتی تھیں۔ انہوں نے فاؤنڈیشن فار انٹر کمیونٹی ریلیشنز یعنی ''فکر'' (FICR) کے نام سے ایک ٹرسٹ قایم کیا تھا۔ اس کے تحت وہ دیہات کے مدارس کی سرپرستی کر کے وہاں پر زیر تعلیم طلبا کی ذہنی و فکری تربیت کا کام کرتے تھے۔ ایک تنظیم انہوں نے ''دوستانِ کشمیر' کے نام سے قایم کی تھی جو عوامی رابطہ کے ذریعہ کشمیر میں امن و امان بحال کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ ان کی قایم کردہ ایک اور تنظیم ''نمرانہ'' پاکستان کے ساتھ عوامی سطح پر مفاہمت کے فروغ کیلئے کام کرتی تھی۔ سابق وزیر اعظم ہند شری اٹل بہاری باجپائی کی قیادت میں جب ایک اعلیٰ سطحی وفد پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم جناب نواز شریف کی دعوت پر لاہور گیا تھا تو پروفیسر علی محمد خسرو بھی اس میں شامل تھے۔ جرمنی اور ہندوستان کے مابین دوستانہ تعلقات کو بڑھاوا دینے والی کئی تنظیموں سے ان کی وابستگی تھی اور وہ فیڈریشن آف انڈو جرمن سوسائٹیز کے صدر بھی رہے۔

۲۰۰۳ء کی گرمیوں میں احقر کو یورپ کا سفر کرنا تھا۔ روانگی سے پہلے، جون کے مہینے میں خبر ملی کہ ہمارے ایک برگزیدہ سابق وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر سفر آخرت پر روانہ ہوگئے ہیں۔ یہ ایک زبردست ذہنی جھٹکا تھا لیکن مزید بھونچال آنا تو ہنوز باقی تھا۔ میں ان دنوں پولینڈ میں تھا جب سراج حسین صاحب (وائس چانسلر جامعہ ہمدرد) کا یہ پیغام ملا کہ ''خسرو صاحب ۲۴ اگست کو داغ مفارقت دے گئے ہیں''۔ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے، ہم تو اپنی زندگی میں اب خسرو جیسا کوئی دوسرا شاید نہیں دیکھ پائیں گے۔ سچ یہ ہے کہ ہم جیسے درجنوں بالشتیے ایک کے اوپر ایک کھڑے ہو جائیں تو بھی ان کے قد کی برابری نہیں کر سکتے۔ جنت کے حور و غلمان کو اگر اردو شعر و ادب سے کچھ واقفیت ہوگئی تو خسرو صاحب وہاں بھی ہیرو بن کر رہیں گے۔ کاش بہشت کے باغیچوں میں پھر سے موصوف کی محفلیں جمیں اور ہمیں بھی باریابی کی سعادت نصیب ہو!!

حوالے:

۱۔ امیر عارفی (۲۰۰۱): علیگڑھ اور خسرو صاحب۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۳۷ تا ۴۶) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔
۲۔ اختر الواسع اور فرحت احساس (۲۰۰۱): خسرو صاحب سے ایک ملاقات۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۶۷ تا ۱۱۰)۔
۳۔ خواجہ محمد شاہد (۲۰۰۱): خسرو صاحب اور علیگڑھ۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۱۱۱ تا ۱۱۸)۔
۴۔ مجتبیٰ حسین (۲۰۰۱): یہ مسائل معیشت یہ ترا بیان خسرو۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۵۷ تا ۶۴)۔
۵۔ سراج الدین (۲۰۰۱): خسرو صاحب، ایک تأثر۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۱۵ تا ۲۲)۔
۶۔ ثاقب صدیقی (۲۰۰۹): راقم کے نام علیگڑھ سے ایک ذاتی خط (اگست ۲۰۰۹ء)
۷۔ محمد شفیع (۲۰۰۱): عہد ساز شخصیت علی محمد خسرو۔ کتاب نما (خاص شمارہ، نومبر ۲۰۰۱ء صفحات ۲۳ تا ۳۰)۔
۸۔ محمد یاسین انصاری (۲۰۰۳): پروفیسر علی محمد خسرو۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (نومبر ۲۰۰۳ء، صفحات ۳۲ تا ۳۴)، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ۔
۹۔ خواجہ محمد شاہد (۲۰۰۳): ہمارے خسرو صاحب۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (نومبر ۲۰۰۳ء، صفحات ۳۵ تا ۳۸)۔
۱۰۔ محمد اقبال (۲۰۰۹): علی محمد خسرو: ہم جس زمین پر بھی رہے آسماں رہے۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق (اگست ۲۰۰۹ء، ص ۴۲ تا ۵۴)۔

***

علی گڑھ میں میرے شب و روز

از پروفیسر محمد نسیم فاروقی
وائس چانسلر: ۱۹۹۰-۱۹۹۴

تلخیص وتوضیحات از پروفیسر نورالحسن نقوی
سابق چیئرمین شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی

اب اسے خدا کی رحمت خاص ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں کہ علی گڑھ کو جو بھی وائس چانسلر ملا وہ علی گڑھ کے لئے نعمت خداوندی بنتا گیا اور اپنے وقت میں علی گڑھ کے لئے کچھ نہ کچھ ایسا اچھا کر گیا جو مدتوں تک بھلایا نہ جا سکے گا، علی گڑھ سے لیا بہت کم، دیا بہت کچھ، کبھی کبھی تو اتنا کہ اپنے آپ کو بھی داؤں پر لگا دیا۔

مرحوم و مغفور پروفیسر محمد نسیم فاروقی نے علی گڑھ کے اپنے وائس چانسلری کے زمانے کے بارے میں کتاب لکھی جس کا نام تھا My Days in Aligarh (مائی ڈیز ان علی گڑھ)۔ یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کا ایک نسخہ یونیورسٹی کی لائبریری/ ادارہ علوم اسلامیہ کے کتاب خانے کی نذر کیا گیا، جہاں سے، روایت ہے کہ، فاروقی صاحب کو پسند اور ناپسند کرنے والوں نے دسیوں نقول دست بدست ایک دوسرے کو تحفے میں دیں۔ یہ بھی سنا کہ بعد میں کسی باقاعدہ پبلشر نے اسے ایک باقاعدہ ایڈیشن کی شکل میں بھی شائع کر دیا۔

طیب جی مرحوم کی طرح فاروقی صاحب مرحوم نے بھی مقررہ مدت سے کم عرصہ گزارا، اور دونوں تھوڑے سے دنوں میں ہی علی گڑھ کی محبت میں ایسے گرفتار ہوئے کہ پھر مدت العمر اپنی اس دل سوز وابستگی کو فراموش نہ کر سکے؛ جب تک باہر نہ گئے کورٹ کی میٹنگ میں بھی برابر شریک ہوتے رہے، علی گڑھ کو کمپیوٹر دور بلکہ موڈرن ایج میں داخل کرنے کا تاریخی اقدام بھی انھیں کا کارنامہ ہے۔ ان کی انگریزی کتاب کے علاوہ فاروقی صاحب کی علی گڑھ کے قیام کی بس ایک ہی یادگار ملتی ہے؛ بے حد مختصر اور سرسری مگر غنیمت! اردو کے پروفیسر نورالحسن نقوی مرحوم نے، مائی ڈیز کی ۱۹۹۴ء میں خاموش اشاعت کے کچھ ہی دن بعد اخبار قومی آواز میں اس کا ایک خلاصہ شائع کیا تھا (جس میں ان کا تبصرہ بھی ملا جلا تھا)۔ اب جب کہ سرسید اور ان کی تحریک کی مختلف جہات وادوار کو یاد کیا جا رہا ہے تو وہ مرحوم بھی یاد آیا جس نے علی گڑھ کے لئے اپنی جان کی بازی کھیلی تھی۔ اور علی گڑھ کو کچھ دے کے ہی گیا، لے کے کچھ نہیں گیا۔ ع

خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر

(علیگ)



ترجمانی از نورالحسن نقوی:

پروفیسر محمد نسیم فاروقی ۱۵؍ اکتوبر ۹۰ء سے ۱۵؍ دسمبر ۹۴ء تک یعنی تقریباً سوا چار سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ علی گڑھ میں گزارے ہوئے شب و روز کی روداد انھوں نے ایک انگریزی کتاب "مائی ڈیز ان علی گڑھ" میں قلم بند کی ہے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے علی گڑھ کو دیکھنے اور اس کی خوبیوں خامیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جو نتائج انھوں نے اخذ کیے ہیں ان پر غور کرنا بہر حال ضروری ہے۔ تاکہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے جو اس تعلیمی ادارہ کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں اور اسے اس بلندی پر پہنچایا جا سکے جہاں پہنچانا ملک و ملت کے خدمت گزاروں کا فرض ہے۔ فاروقی صاحب کی یہ کتاب بازار میں دستیاب نہیں ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تنقیدی خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا منصب سنبھالنے سے پہلے پروفیسر فاروقی ۳۸ سال کی طویل مدت تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور سے وابستہ رہے تھے اور وہاں مختلف نوعیت کے انتظامی اور تعلیمی امور کا تجربہ حاصل کر چکے تھے انھیں یقین تھا کہ اس تجربہ کی مدد سے وہ علی گڑھ میں پیش آنے والے ہر مسئلے کو بحسن و خوبی حل کر سکیں گے مگر یہ اندازے کی غلطی تھی۔ علی گڑھ اور کھڑک پور کی دنیائیں ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہوئی ہیں اور ایک پر دوسرے کا قیاس کرنا درست نہیں۔ فاروقی صاحب علی گڑھ کو سمجھ نہیں پائے۔ چارج لینے کے بعد فاروقی صاحب کی پہلی کوشش یہ رہی کہ ان کی ذات سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ طلبا کو طرح طرح کی مراعات سے نوازا گیا، اساتذہ کی ترقیوں کے مسدود راستے پھر سے کھولے گیے انتظامی عملے کے گریڈ بڑھائے گئے، درجۂ چہارم کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافے ہوئے جن لوگوں میں خلوص اور اعلا کار کردگی کی صلاحیت نظر آئی انھیں یونیورسٹی کے نظم ونسق کی ذمہ داری سونپی گئی۔ آسکر وائلڈ کا یہ قول فاروقی صاحب کو بہت بعد میں یاد آیا کہ کبھی کسی کے ساتھ نیکی نہ کرو۔ مشتاق یوسفی نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ وہ زمانہ رخصت ہوا جب نیکی کر کے دریا میں ڈالی جاتی تھی اب تو وہ زمانہ ہے کہ نیکی کرنے والے کو دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ سچ بات نہ یہ ہے نہ وہ۔ سچ یہ ہے کہ کم ظرفوں کے ساتھ نیکی کرنے والے کو پچھتانا پڑتا ہے۔ یہ ہمارا نہیں شیخ سعدی کا قول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلص لوگوں نے فاروقی صاحب کا ساتھ دیا، مطلب پرست مطلب نکل جانے کے بعد اپنے محسن کو بھول گئے۔

فاروقی صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ۱۹۸۱ء میں پارلیمنٹ کے ذریعہ کی گئی ترمیم کے بعد اس ادارے کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی فلاح و بہبود کا بار اسی کے کاندھوں پر ہے مگر یونیورسٹی اپنا فرض پورا نہیں کر پا رہی۔ کچھ دنوں اور غفلت برتی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی صرف اتر پردیش بلکہ مغربی اتر پردیش کا ایک معمولی تعلیمی ادارہ بن کے رہ جائے گی۔ جن خامیوں کو فاروقی صاحب نے اس صورت حال کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

فاروقی صاحب کی رائے ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء میں ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کی بہ نسبت زیادہ ضبط و نظم پایا جاتا ہے اور ماضی میں اس ادارے کو جو نا موری حاصل ہوئی اس کا سہرا طلباء کے سر ہے لیکن آج دوسرے ہم وطنوں کے مقابلے میں ان میں تعلیم کا شوق کم ہے ان کے والدین تعلیم یافتہ نہ ہونے کے سبب کورس وغیرہ کے انتخاب میں ان کی صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر ہیں اور طلباء خود تو عموماً شورش برپا نہیں کرتے لیکن بہ آسانی دوسروں کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ مفاد پرست اس کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اساتذہ سے فاروقی صاحب کو بہت سی شکایتیں ہیں مثلاً۔

(۱) کبھی کبھی کم صلاحیت اساتذہ کا کسی نہ کسی طرح تقرر ہو جاتا ہے، پڑھنا پڑھانا ان کے بس کا روگ نہیں، ان کا وقت سازشوں اور شرارتوں میں صرف ہوتا ہے۔ ذاتی اغراض حاصل کرنے اور اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لئے طلباء کا استعمال کرتے ہیں۔ جوڑ توڑ، سفارشیں، گروہ اور کنبہ کے اثرات ان کے استحکام اور مزید ترقی کا سبب بنتے ہیں۔

(۲) معمولی متوسط گھرانوں سے آئے ہوئے اساتذہ کو کوئی انتظامی عہدہ مل جائے پرووسٹ وارڈن یا پراکٹر بن جائیں تو ان کا طمطراق قابل دید ہوتا ہے۔ پورا کنبہ اس عہدے کا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس پر ناز کرتا ہے۔ اس طرح کا عہدہ حاصل کرنے کے لئے بظاہر مہذب نظر آنے والے استاد طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔

(۳) علوم میں تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی ہے اور بیشتر اساتذہ اس سے بے خبر ہیں۔ نصاب میں تبدیلی کرتے ہوئے وہ گھبراتے ہیں کہ مطالعہ کرنا ہوگا، محنت کرنی پڑے گی۔

(۴) اسٹاف کے بہت سے ممبران روپیہ کمانے کی فکر میں برسوں بیرونی ممالک میں نوکری کرتے ہیں، ان میں ایسے لوگ

بھی تھے جو کسی موضوع پر ریسرچ کر رہے یا کرا رہے تھے اس کام کو وہ ادھورا ہی چھوڑ گئے۔

(۵) باہر کی تازہ ہوا کے لئے یونیورسٹی کے دروازے عام طور پر بند رہے۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ طالب علم نے یہاں تعلیم پائی اور یہیں لیکچرر ہو گیا۔ علی گڑھ سے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی پوری طرح واقفیت وہ حاصل ہی نہ کر سکا۔

(۶) بہت سے طلباء تو اچھی ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملازمت تو پا لیتے ہیں لیکن اعلا کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ سبب یہ کہ علی گڑھ میں ان کی تعلیم مستحکم بنیادوں پر نہیں ہوتی اور جدید ترین ترقیوں سے وہ ناواقف رہے۔

(۷) علی گڑھ میں محنت و جفاکشی کا ماحول نہیں۔ شعبئے عموماً دو بجے تک بند ہو جاتے ہیں زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس میں انجینیرنگ کالج بھی شامل ہے؛ بارہ ساڑھے بارہ بجے استادوں کو بھوک لگنے لگتی ہے۔

(۸) رقم کا بڑا حصہ شعبوں کی تقریبات ،قالین فرش، پردوں صوفوں، پر خرچ ہوتا ہے خواہ اہم اخراجات کے لئے روپیہ بچے یا نہ بچے۔

(۹) بارہا ایسا ہوا کہ کسی ڈپارٹمنٹ کو سرکار کی طرف سے کوئی بڑی رقم ملی اور اس کا بیشتر حصہ خرچ نہ ہو سکا۔ کبھی کبھی تو پوری رقم لوٹائی گئی۔ ایک بار ۷۷ لاکھ روپیہ ملا اور خرچ نہ ہو سکا انجینیرنگ کالج کے ایک شعبے نے تو ایک بڑی رقم یہ کہہ کر لوٹا دی کہ اس پروجیکٹ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ایک بار پوری رقم استعمال نہ ہو تو آئندہ کے لئے امداد گھٹا دی جاتی ہے۔

(۱۰) لوگوں کی بے حسی اور لاپرواہی کے سبب بہت سی مشینیں استعمال ہی نہ ہوئیں اور پڑی ہوئی زنگ کھاتی رہیں (کرنل بشیر حسین زیدی فرماتے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی مہربانی سے انہوں نے یونیورسٹی پریس کے لئے کئی جدید ترین مشینیں خریدی تھیں جو برسوں بعد تک کھولی بھی نہ گئیں اور برباد ہو گئیں۔ دراصل ہمارا پریس یونیورسٹی کا سب سے برباد محکمہ ہے)۔

(۱۱) تقرر کے وقت بسا اوقات امیدوار کی صلاحیت کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جوڑ توڑ، سعی و سفارش نے بھی اس معاملے میں اہم رول ادا کیا۔

(۱۲) ملک و ملّت کے لیڈران نے علی گڑھ کے نام کو اپنے سیاسی فائدوں کے لئے استعمال کیا، ہمارے اولڈ بوائز نے یونیورسٹی سے پایا بہت زیادہ اور دیا بہت کم۔ کورٹ کے ممبران یونیورسٹی کی ترقی کے لئے کوئی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ ملّت کے نام پر یونیورسٹی کے علمی معاملات میں نامناسب مداخلت کی جاتی رہی۔

(۱۳) اخبارات سے فاروقی صاحب کو شکایت ہے کہ ان کا رویہ یونیورسٹی کے سلسلے میں بالعموم مخالفانہ ہی رہا تعلیمی ادارے جس احترام کے مستحق ہیں وہ انہیں کسی گوشے سے بھی نہیں ملتا۔ ہمارے اخبارات ان افواہوں کو بھی نمایاں طور پر چھاپتے ہیں جن کا جھوٹ اور من گھڑت ہونا پہلی نظر میں ہی صاف نظر آ جاتا ہے۔ فسادات کے دوران یہ بے بنیاد خبر خوب اچھالی گئی کہ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں بہت سے ہندو مریض قتل کر دئے گئے۔ اپنے اس مرض کا علاج تو اخباروں کو خود ہی ڈھونڈنا ہوگا۔

(۱۴) یونیورسٹی انتظامیہ اور پولیس دونوں کو ایک دوسرے سے شکایت رہی ہے۔ یونیورسٹی کو ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ پولیس اس کے ساتھ بھرپور تعاون نہیں کرتی اور پولیس کو یہ شکوہ کہ برا وقت پڑنے پر یونیورسٹی اور انتظامیہ کو پولیس یاد آتی ہے۔ یہ وقت ٹل جاتا ہے تو اپنی مرضی سے جب چاہتی ہے پولیس کو نکال باہر کرتی ہے۔ اسے یونیورسٹی کے علاقہ میں داخل ہونے اور مجرموں کو گرفتار کرنے کی آزادی نہیں دونوں کی شکایتیں حق بجانب ہیں۔ عام شہریوں کی حفاظت پولیس کی ذمہ داری ہے تو طلباء اور اساتذہ اس سے مستثنیٰ کیوں ہیں اور تعلیمی ادارے اس کے لئے ممنوعہ علاقہ کیوں ہیں۔ یہ بات بالکل درست بشرطیکہ پولیس دیانت دار اور منصف مزاج ہو، ہمارے لئے تو پولیس کے ساتھ ہاشم پورہ اور ملیانہ جیسی سیکڑوں جگہوں کی تلخ یادیں وابستہ ہیں جہاں بیسیوں نوجوانوں کو گولی مار مار کے مردہ جانوروں کی طرح دریا میں اچھال دیا گیا۔

(۱۵) یونیورسٹی اسٹاف کے بچوں کو داخلے میں رعایت دی جاتی ہے فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ بدنظمی کے اصل ذمہ دار یہی طلباء ہیں کیونکہ انہیں یونیورسٹی کے با اثر لوگوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ رعایت کے باوجود وہ داخلہ پانے میں ناکام رہتے ہیں تو نامزدگی (نامینیشن) کا سہارا لیا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ نامزدگی کا یہ طریقہ ختم ہونا چاہئے۔ جس افسر یا لیڈر کے لڑکے یا لڑکی کا وائس چانسلر داخلہ نہ کر پائے وہ دشمن ہو جاتا ہے۔ فاروقی صاحب نے نامزدگی کے طریقے کو ختم کرنے کی کئی بار ناکام کوشش کی۔

محمڈن کالج کے سکریٹری وقار الملک کی سخت گیری اور محسن الملک کی نرم مزاجی کے پیش نظر مولوی نذیر احمد کہا کرتے تھے ایک سب لوہا ہی لوہا ہیں اور دوسرے سب تیل ہی تیل۔ جب تک یہ لوہا اور تیل نہ ملے کالج کی مشین چل نہیں سکتی۔ ادھر ایک عرصہ سے علی گڑھ کا المیہ یہ ہے کہ وائس چانسلر کا منصب کسی استاد کو تفویض ہو تو کچھ ہی دنوں میں اس کی نرمی کے مضر نتائج سامنے آ جاتے ہیں اور لوگ اسے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ کوئی آئی۔اے۔ایس۔ ایڈمنسٹریٹر وائس چانسلر مقرر ہو تو اس کی سخت گیری اور آمرانہ رویہ لوگوں کو ناگوار ہونے لگتا ہے۔ ایسا سربراہ کہاں سے میسر آئے جو بیک وقت فولاد بھی ہو اور موم بھی۔

پروفیسر فاروقی نے اس عزم کے ساتھ علی گڑھ میں قدم رکھا کہ محبت سے دلوں کو جیتیں گے، دوستانہ ماحول اور خوشگوار فضا قائم کر کے تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنائیں گے مگر محبت کا یہ نسخہ کارگر نہ ہوا کیونکہ علی گڑھ کے اس مریض کے علاوہ کڑوی دوا کی خوراک بھی درکار ہے نتیجہ یہ ہوا کہ فاروقی صاحب کو مقررہ وقت سے پہلے مستعفی ہونا پڑا۔

فاروقی صاحب نے اپنے دور میں متعدد ایسے کارنامے انجام دئے جنہیں ہمیشہ احسان مندی کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ (۱) آج کا دور کمپیوٹر کا دور ہے اور فاروقی صاحب اس کے ماہر ہیں انہوں نے انجینیرنگ کالج میں کمپیوٹر کورس شروع کیا، تمام طلباء کے لئے کمپیوٹر کورس کو لازمی قرار دیا، کمپیوٹر کے ذریعہ اردو میں ترجمے کا شعبہ قائم کیا۔ اور مختلف شعبوں کو اس نعمت سے روشناس کیا۔ (۲) سائنس، ٹکنالوجی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زور دیا تا کہ نوجوانوں کو تعلیم مکمل کرنے پر بہ آسانی روزی کمانے کے مواقع حاصل ہوں۔ اس سلسلے کا سب سے اہم کورس ''آرکٹکچر'' تھا جس کی منظوری تو مل گئی لیکن فوری طور پر پچیس لاکھ کی رقم درکار تھی۔ یو۔جی۔سی۔ سے گرانٹ ملنے میں دو سال لگ جانے کا اندیشہ تھا لیکن جہاں چاہ وہاں راہ۔ یو۔اے۔ای۔ کے حکمران نے پیغام بھیجا کہ وہ تقریباً اکتیس لاکھ روپے کسی اہم کام کے لئے یونیورسٹی کو دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح یہ مہم سر ہو گئی۔ اس کے علاوہ ٹورزم، فنانس انٹرنیشنل بزنس ہوٹل ورک، ایگریکلچر کے اہم کورس شروع کئے گئے۔

(۳) یونیورسٹی کے ایک قدیم طالب علم جناب ندیم ترین کے تعاون سے ایک نہایت شاندار اقامت گاہ تعمیر ہوئی، اس کا سہرا پروفیسر نسیم فاروقی اور پروفیسر ابوالحسن صدیقی کے سر ہے۔

(۴) لڑکیوں کے لئے ایک اقامت گاہ تعمیر ہوئی۔ قاضی پاڑہ کے گرلز اسکول کو ترقی دی گئی۔ یہاں اختصار سے کام لیا گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فاروقی صاحب نے ان کے علاوہ بہت سے اہم کام کئے اور بہت کچھ وہ کرنا چاہتے تھے لیکن عدم تعاون اور شورش نے اس کا موقع نہیں دیا۔ فاروقی صاحب کی نرم مزاجی بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ قصوروار طلباء کے خلاف کارروائی اور پھر کسی نہ کسی دباؤ سے اس کا واپس لے لیا جانا علی گڑھ کی تعلیمی فضا کو پراگندہ کرنے کا اصل سبب بنا اور ان کی ساری محنت پر پانی پھر گیا۔

آج کے بدلے ہوئے حالات میں ہماری یونیورسٹی کو بھی بدلنا ہوگا ورنہ ہماری آنے والی نسل کے لئے جینا دشوار ہو جائے گا۔ اس بارے میں فاروقی صاحب کے مشوروں کو ملحوظ رکھنا مفید ہوگا۔

فاروقی صاحب کی صلاح ہے کہ پروفیشنل ایجوکیشن کی طرف توجہ ضروری ہے۔ لکھنؤ میں میڈیکل کالج کھولنے کی فاروقی صاحب کی کوشش ناکام ہو گئی تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ حکومت کی نئی پالیسی سے فائدہ اٹھا کر ملک میں جا بجا میڈیکل ،ڈینٹل کالج، انجینیرنگ کالج قائم کرنے چاہئیں۔ (روزنامہ ملک کی شان، رامپور، ۲۰ مارچ، ۱۹۹۷)

☆

پس گفتار

فاروقی صاحب کے اسی دلدوز سُر میں علی گڑھ سے ایک اور دکھی آواز اٹھی تھی جب علی گڑھ کے ایک متوالے نے فاروقی صاحب مرحوم سے دس بارہ سال پہلے ایسے ہی دکھ کے ساتھ کہا تھا:

سید احمد سے سید حامد تک ۱۸۷۵ء سے ۱۹۸۵ء تک، اور پھر سید حامد سے حامد انصاری تک، (۱۹۸۵-۲۰۰۲) علی گڑھ تحریک نے ڈوبتے اچھلتے، چالیس اوپر سو برس پورے کر لئے۔ اچھے برے دونوں وقت آتے رہے اس پر: برے زیادہ، کہ ہر تحریک کی سرنوشت میں یہ اس کی تقدیر بن کے شامل رہی ہے، شاید اسی لئے کہ تحریک کی آبیاری کے لئے یہ ناگزیر ہے، لیکن تحریک پر ایمان رکھنے والے صورتِ خورشید اِدھر ڈوبے نہیں کہ اُدھر نکل آتے ہیں۔ ایقان اور ایمان کے مقابلے کی طاقت سائنس بھی ابتک پیدا نہیں کر سکی ہے۔ آگ میں کود پڑنے والوں کو کون زیر کر سکا ہے! سید اعظم نے اپنی زندگی میں اپنی تحریک کو پروان چڑھتے دیکھ لیا تھا۔ ان کے بعد انہیں ان ہی جیسے مخلص ساتھی، محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، چراغ علی، عزیز مرزا ادارہ اور تحریک دونوں شمعوں کو، دونوں ہاتھوں میں لئے منور کئے رہے۔ پھر سید کی تربیت گاہ کے پروردہ آفتاب احمد خاں، مزمل اللہ خاں، ضیاء الدین، راس مسعود، اور دوسرے اپنے اپنے طریق پر اپنی درسگاہ کی خدمت کرتے رہے تا آنکہ سنہ سینتالیس آ گیا: یہ امتحان کی گھڑی تھی، جس ادارے نے بیک وقت پاکستان کے لئے، ہونے والا وزیر اعظم (لیاقت علی خاں) اور ہندوستان کے لئے، ہونے والا وزیر با تدبیر رفیع احمد قدوائی پیدا کیا ہو، ہونے والا صدر پاکستان (ایوب خاں) اور ہونے والا صدر جمہوریۂ ہند (ذاکر حسین) بنایا ہو، اس ادارے کے لئے سخت گھڑی تھی یہ۔ بڑی قومیں جتنے کڑے امتحان سے دوچار ہوتی ہیں اتنا ہی بڑا آدمی بھی کاڑھ لیتی ہیں۔ آزاد ہندوستان کا علی گڑھ جتنی بڑی آزمائش سے دوچار تھا اس سے نبٹنے کے لئے اس نے اس بار اتنا ہی بڑا آدمی پیدا کر دیا: ذاکر صاحب علی گڑھ کو محض ادارہ ہونے سے بچا لے گئے، اور جاتے جاتے ایسا زبر دست مومنٹم (Momentum) دے گئے جو اتنی ہی مدت مزید چلتا گیا۔

مومنٹم (Momentum) ختم ہوا تو علی گڑھ کے ساتھ چلنے والے کم، زمانے کے ساتھ چلنے والے زیادہ نظر آنے لگے۔ سردارِ قافلہ مزاج متعین کرتا ہے: سو وہ کرتا رہا؛ نتیجہ میں ایک فرزندِ علی گڑھ (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، لکھنؤ) کو روہانسے قلم سے لکھنا پڑا:

"اس ادارے نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی؛ اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک وملت کے لئے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے۔ لیکن آگے چل کر اگرچہ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز وسامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی جس نے اسے تعلیم وتہذیب کی ایک بڑی تحریک بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم رہے جوان کی پہلی پیڑھی کا طرۂ امتیاز تھا۔ انہوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلہ سے آنکھ چرائی، مقاصد کو معیار کا بدل سمجھا، انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں کی صف میں بیٹھ گئی۔ اور ایک جیتا جاگتا، امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ ضابطہ، آسائش، بے آہنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔"

اسی لئے، اسی ردیف وقافیہ میں، جلتے سلگتے ذہن کے ساتھ، علی گڑھ کے ایک اور عاشق کے قلم سے لفظ آنسو بن کے ٹپک پڑے۔

"شروع میں .... معمولی، درجہ کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں، عمارت پختہ نہیں تھی، اساتذہ کے لئے آرام دہ مکانات نہیں تھے، چمن بندی نہیں تھی... لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بے چینی نہیں تھی۔ طلباء اور اساتذہ میں باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے ہمدرد و مونس وغمخوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی لیکن اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے!

"اب: اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرال میں! شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن یہاں صرف خامیوں پر نظر رہتی ہے اور صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے... کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے جو اس کے بانیوں نے دیکھا تھا؟ اسی طرز کے کردار کے لئے انہوں نے اپنی نیندیں حرام کیں تھیں اور در در کی بھیک مانگی تھی ....؟ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیاوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مسئلہ ہی نہ ہو؛ انہیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی ...؛ اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں اور ہر قسم کی رہائشی اور دوسری سہولتوں کے باوجود ہر دن کسی کا شکوہ کریں گے؛ اور ایسے فرزندان قوم آئیں گے جو ہر دن مراعات کا مطالبہ کریں گے: امتحان کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ داخلوں کا مطالبہ، اساتذہ کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں بہن کی گالی سے لے کر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک، بلّم، چھری، چاقو، پستول کی دھونس! اس کام کے لئے ادارہ کی ضرورت نہیں تھی! اس کے لئے تو پڑھا لکھا ہونا بھی شرط نہیں! اس کے لئے مسلمان ہونے کی بھی شرط نہیں!!

"مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی ہے۔ اچھے طالب علموں کی تلاش، ان کی سرپرستی، اور اکثر اپنی یافت کا بڑا حصہ ان پر لگا دینا، انکے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو باقی رکھا۔ ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا تھا جو بادِ سحر کی نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انہیں کھلے ہوئے پھولوں میں تبدیل کر دیتا! دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ ایسے لوگوں کا تناسب گھٹ رہا ہے اور ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آ گئے ہیں اور ذرا ان کو بہتر مواقع کے آثار کہیں نظر آئے اور انہوں نے طوطا چشمی کی۔ یہاں تو لوگ کشتیاں جلا کے آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے! ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے"!!

○

۱۹۸۰ء میں ایک بار پھر ادارہ، تحریک میں تبدیل ہونے لگا ادارہ کو جامد کرنے والی قوتوں اور تحریک بنانے والی قوتوں میں گھمسان کا رن پڑا جو پورے پانچ سال چلتا رہا۔ اس بار تحریک کے احیا کا شرف سید حامد کے حصے میں آیا۔ وہ ڈاکٹر ضیاء الدین، ذاکر صاحب اور رشید صاحب کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، خود اسی مادر درسگاہ کے زائیدہ تھے، اعلیٰ انتظامی امور میں طویل تجربہ کے مالک تھے، دردمند دل اور کھلے دماغ کے ساتھ اپنے پر ایقان تھا اور اپنے پیدا کرنے والا پر ایمان، کہ اس نے جو مشن دیا ہے اسے پورا کرنے کا حوصلہ بھی بخشے گا۔ راہیں بھی نکالے گا۔ دینے والے ربّ کریم نے لینن اور ماؤ کی طرح سیف وقلم دونوں کی صلاحیتوں سے اپنا کام لینے کے بقدر پوری طرح نوازا تھا، صورت حال کے اس فرق کے ساتھ کہ یہاں رزم آرائی پرایوں سے نہیں اپنوں سے تھی۔ اور یہ مرحلہ زیادہ کڑا ہوتا ہے!

سید احمد پر ایک بار یہ گزر چکی تھی: جنہوں نے ایک طرف ادارہ کو در و دیوار دیئے، اس میں نقش ونگار بھرے، تعلیم دی، تربیت کی تو، دوسری طرف زبان اور قلم سے ادارہ کو تحریک بنانے کا کام بھی انجام دیتے رہے، یہ دو محاذی مورچہ انہی کی تربیت گاہ کے پرورش یافتہ سید حامد نے اسی خوش اسلوبی سے سر کیا جیسے سید اعظم اس وقت رہتے تو کرتے۔

سید حامد کی روایت کو سید ہاشم نے اور آگے بڑھایا۔ سید حامد کی طرح وہ بھی ایڈمنسٹریشن کے طویل تجربہ سے گزر کے جامعہ عثمانیہ کی وائس چانسلری کا اکیڈمک تجربہ لے کے آئے تھے اس لئے جھیل گئے۔ شاید اس لئے بھی کہ راستے کے اچھے خاصے کانٹے تو سید حامد نے چن ہی لئے تھے۔ تاہم، کہتے تھے علی گڑھ نے دل کی بیماری ضرور لگا دی۔ پھر بھی علی گڑھ دل سے کبھی نہیں نکلا۔

اب سید حامد اور سید ہاشم کے بعد آنے والے کو کچھ تو جھیلنا ہی تھا۔ اکیڈمیشین بھی پکے والے نہیں تھے، اور آئی. اے. ایس. تو تھے ہی نہیں۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی جھیلنا تھا۔ چنانچہ مدتِ کار سے سات آٹھ مہینے پہلے ہی استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ جاتے جاتے علیگڑھ کو بہت کچھ دے گئے۔

کانپور میں صاحبزادے بڑے کامیاب سرجن ہیں۔ اس لئے فاروقی صاحب وہیں رہ پڑے اور وہیں چند سال قبل وفات پائی۔ (علیگ)

***

ڈاکٹر اصغر عباس کے نام

ضیا بار افراد کے خطوط

ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، جگ جگ جئیں۔

بھئی کمال کر دیا ایسی اچھی کتاب، ایسی خوبصورت کتاب، ایسی ورائٹی، جب جی چاہا، جہاں سے چاہا، اٹھالیا اور لطف آ گیا۔ زندہ باد۔

یہ تو خیال ہی نہیں تھا کہ اتنے مزیدار خطوں کا ایسا شاندار مجموعہ بھی پڑھنے کے لئے مل جائے گا!

ابھی تک سرور صاحب اور آفاق احمد کے بعد جمیل جالبی کو پڑھ لیا۔

اس میں ابن فرید بھی موجود تھے۔ اور پھر ہمارے نجات اللہ صدیقی صاحب نے اب سے تیس چالیس سال پہلے جو خطوط چھاپے تھے اس کی یاد آ گئی، ابن فرید کے کئی لمبے لمبے خط تھے ان کے مجموعے میں۔ نجات صاحب کی آخری خیر خبر یہ ملی تھی کہ امریکا میں ہیں اور عابد اللہ اور یہ دونوں علیل ہیں، کبھی ان کے اعزہ سے کہوں کہ تصویری ملاقات کرا دیں۔ نجات اللہ کا مجموعہ مکاتیب شاید آپ نے دیکھا نہ ہو، تلاش کرائیں تو اسے پڑھنے میں مزہ آئے گا، آپ کے مجموعے کے مقابلے میں اگر کسی کو رکھا جاسکتا ہے تو بس اس کو۔ وہی سج دھج، وہی تنوع، وہی مزہ۔

نجات اللہ کی بات چھڑ گئی اور اصغر عباس غائب۔ آپ کے پرنٹر کے لئے بھی دل سے دعا نکلی، بلکہ آپ کے کاتب کے لئے بھی۔ دیکھیے کاتب کا لفظ لکھ گیا، اب کاتب کہاں، اور کتابت کہاں، اب تو مشین کا زمانہ ہے۔

کتاب کا آخری حصہ بھی جھانک لیا، اس پر تو پہلے نظر ہی نہیں پڑی تھی، یہ تصویری حصہ تو بڑا غضب کا ہے، بہت اچھا کیا یہ شامل کر دیا۔ اب میں دیکھوں گا اس میں خاص خاص تصویریں جو مجھے اچھی لگیں وہ یہ ہیں:

۱۔ ص۴۱۶ (اصغر عباس، علیم صاحب کے ساتھ)۔
۲۔ ص۴۲۵ (اصغر عباس، شہناز ہاشمی کے ساتھ)
۳۔ ص۴۲۷ (اصغر عباس، عبداللہ کے ساتھ)
۴۔ ص۴۳۷ (خورشید الاسلام کے ساتھ، ۱۹۷۶۔۱۹۷۷ء)
۵۔ ص۴۴۱ (قیصر جہاں کے ساتھ)
۶۔ ص۴۴۸ (عبدالرحمٰن کیساتھ)
۷۔ ص۴۷۲ (جسٹس احمدی کیساتھ)

مگر اس تصویری حصہ پر جو آپ نے شعر لکھا ہے وہ تو لطف مکرر لے ہی لوں، بلکہ اس لطف میں آپ کو بھی شریک کر لوں، کیا اچھا استعمال ہے اس شعر کا:

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

مدت سے مجھے یہ شعر یوں یاد تھا:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن تبسم کیا

آج آپ کے اس تصویری حصے کے سرِ فہرست یہ شعر آپ کے نقل کردہ ورژن کے مطابق پڑھا تو تصحیح ہو گئی، اصل میں تو آپ نے ہی صحیح لکھا ہے، میں غلط پڑھتا تھا، لیکن مزہ دونوں میں ہے، آپ کے ورژن میں شاعر گل کی طرف مڑ گیا اور میرے ورژن میں 'کتنا ہے' کی طرف، دونوں میں اپنا اپنا لطف ہے۔ مگر شاعر نے جیسا کہا تھا ہم اس میں کیوں دخل دیں۔ آپ نے شرافت برتی اور کوئی دخل نہیں دیا۔ میں اس قسم کے دخل اکثر دیتا رہتا ہوں، اور آپ کے استاد رشید صاحب کی طرح آگے پیچھے کر کے پڑھ جاتا ہوں۔

اس شعر کو پڑھ کے بغیر کسی سبب کے جوش کی فرسٹ کلاس رباعی یاد آ گئی:

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لئے کھلتا ہے
غنچے نے کہا ہنس کر اے بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

جگ جگ جئیں بھائی اصغر عباس۔

سرسید ہال کا اولڈ بوائے نمبر بڑی قیمتی دستاویز آپ نے بنا ڈالی تھی، علی گڑھ کے اولڈ بوائز کی۔ اسی سے غالبا آپ کے سفر کا آغاز ہوا تھا، اور یہ سوغات آج تک میری مونس بنی رہتی ہے، ابھی پچھلے دنوں سامنے آ گئی تو دیر تک اس کا میرا ساتھ رہا۔ لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ ضیا بار افراد سے آپ اتنی اچھی ملاقاتیں کرا دیں گے، کہ جب چاہیں گے اسے کھول کے ادھر سے ادھر سے ڈاکٹر اصغر عباس کے ذریعہ مل لیں گے: جب چاہیں گے اور جتنی دیر تک چاہیں گے۔

یہ خط پڑھتے پڑھتے اندازہ ہوا کہ سرور صاحب سے آپ کے کتنے مخلصانہ تعلقات تھے۔ اور پھر یاد آیا کہ اسی سبب آپ نے ان پر اتنا بڑا اسیمینار برپا کر دیا۔ وہ بھی خوش ہوئے ہوں گے، اور آج بھی آپ سے خوش ہوں گے، آپ کے لئے دعا کرتے ہوں گے۔ ان کی بات ان کے ساتھ رہی، ہمیں دیکھیے ہم بھی سرور صاحب کی خوشی میں خوش ہو رہے ہیں، انھیں پڑھ رہے ہیں، اور اصغر عباس کو دعائیں دے رہے ہیں، اللہ آپ کو خوش رکھے۔

بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔

ع ر ب

13 اکتوبر 2020

***

راجہ تصدق رسول ہوسٹل/ راجہ نوشاد علی خاں

ابن فرید (سابق استاد، شعبہ سوشیالوجی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

ہمارے زمانے میں (بھی) ایک بار رسول کا مقدس لفظ جڑا تھا اور حبیب رسول صاحب کا طوطی بولتا تھا، ان کے گلے کا سوز اس فنکشن کی کامیابی کی ضمانت بن جاتا تھا جس میں وہ مہمان خصوصی ہوتے تھے۔ اس سے بھی پہلے ایک لطیفہ آمیز نام خاصا چلتا تھا، بیگم اعزاز رسول کے شوہر۔ مگر اصلی، رسول نام تو ابن فرید مرحوم نے یاد دلایا جن کا ایک خط ڈاکٹر اصغر عباس کے نام مجموعۂ مکاتیب میں چھپا ہے۔ اس سے ایک اقتباس:

"۸ نومبر ۱۹۷۶ء۔ آپ کی نگرانی میں سرسید ہال ریویو کے اولڈ بوائز نمبر کی اشاعت نے نہ صرف بہت سی یادوں کو تازہ کیا ہے، بلکہ علی گڑھ کی تاریخ کے ایک زرّیں دور کو زندہ کر دیا ہے۔

تصدق رسول عربک لکچر ہال (عربک روم نہیں) خود راجہ تصدق رسول نے نہیں بلکہ ان کے بھتیجے راجہ نوشاد علی خاں، تعلقدار میلا رائے گنج و جہانگیر آباد، ضلع بارہ بنکی نے بنوایا تھا۔ مؤخر الذکر میرے والد کے سگے ماموں تھے۔ والد صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ راجہ نوشاد علی خاں، راجہ تصدق رسول کے جانشین تھے۔ سرسید کے رفقاء میں سب سے کم عمر تھے۔ سرسید نے ان کا ذکر اپنے اکثر خطوط میں بے حد محبت کے ساتھ کیا ہے۔ راجہ صاحب ایم اے او کالج کے ٹرسٹی بھی تھے اور تاحیات ٹرسٹی رہے۔

جب اسٹریچی ہال کی تعمیر ہو رہی تھی تو سرسید نے راجہ صاحب سے کہا کہ راجہ صاحب آپ بھی پانچ سو روپے دے کر اپنے نام کا ایک کتبہ اسٹریچی ہال میں نصب کرا دیجئے۔ انھوں نے ادب کے ساتھ جواب دیا: سید صاحب اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ناموں کے بیچ میرا نام کیا اچھا لگے گا۔ آپ تو میرے چچا کے نام سے ایک کمرہ الگ ہی بنوا دیجئے۔ اس طرح یہ تصدق رسول عربک لکچر ہال وجود میں آیا۔

جب منٹو سرکل تعمیر ہو رہا تھا تو اس وقت بھی راجہ صاحب نے اپنے نام کے بجائے اپنے چچا کے نام سے تصدق رسول ہوسٹل تعمیر کرایا۔ یہ تفصیل میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میں نے یہ اپنے والد صاحب سے سنی تھی۔ اور یہ کہیں تحریر نہیں ہے۔ میرے والد صاحب کا بچپن راجہ صاحب کی سرپرستی ہی میں گزرا ہے کیوں کہ میرے دادا کا انتقال والد صاحب کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں جب والد صاحب کالج کے اسکول میں پڑھتے تھے اور ظہور حسین وارڈ میں رہتے تھے تو چھٹیوں کے بعد راجہ صاحب ہی کے ساتھ اکثر علی گڑھ آیا کرتے تھے۔ اس قربت کی وجہ سے ہی یہ واقعہ قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔ میں خود بھی سرسید ہال کا بورڈر رہا ہوں۔"

(ضیا بار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس، ۲۰۲۰ء، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

***

Sir Syed Speaks at Patna

Selected by Ramachandra Guha

Friends, in India there live two prominent nations which are distinguished by the names of Hindus and Mussulmans. Just as a man has some principal organs, similarly these two nations are like the principal limbs of India. To be a Hindu or a Muslim is a matter of internal faith which has nothing to do with mutual relationship and external conditions. How good is the saying, whoever may be its author, that a human being is composed of two elements—his faith which he owes to God and his moral sympathy which he owes to his fellow-being. Hence leave God's share to God and concern yourself with the share that is yours.

Gentlemen, just as many reputed people professing Hindu faith came to this country, so we also came here. The Hindus forgot the country from which they had come; they could not remember their migration from one land to another and came to consider India as their homeland, believing that their country lies between the Himalayas and the Vindhiyachal.t Hundreds of years have lapsed since we, in our turn, left the lands of our origin. We remember neither the climate nor the natural beauty of those lands, neither the freshness of the harvests nor the deliciousness of the fruits, nor even do we remem-ber the blessings of the holy deserts. We also came to consider India as our homeland and we settled down here like the earlier immigrants. Thus India is the home of both of us. We both breathe the air of India and take the water of the holy Ganges and the Jamuna. We both consume the products of the Indian soil. We are living and dying together. By living so long in India, the blood of both have changed. The colour of both have become similar. The faces of both, having changed, have become similar. The Muslims have acquired hundreds of customs from the Hindus and the Hindus have also learned hundreds of things from the Mussulmans. We mixed with each other so much that we produced a new language—Urdu, which was neither our language nor theirs. Thus if we ignore that aspect of ours which we owe to God, both of us, on the basis of being common inhabitants of India, actually constitute one nation; and the progress of this country and that of both of us is possible through mutual cooperation, sympathy and love. We shall only destroy ourselves by mutual disunity and animosity and ill-will to each other. It is pitiable to see those who do not understand this point and create feeling of disunity among these two nations and fail to see that they themselves will be the victims of such a situation, and inflict injury to themselves. My friends, I have repeatedly said and say it again that India is like a bride which has got two beautiful and lustrous eyes—Hindus and Mussulmans. If they quarrel against each other, undoubtedly, that beautiful *bride will become ugly and if one destroys the other, she will lose one eye. Therefore, people of Hindustan! You have now the right to make this bride either squint-eyed or one-eyed.* What to say of Hindus and Mussulmans, a quarrel among human beings is a natural phenomenon. Within the ranks of the Hindus or Mussulmans themselves, or even between brothers as also between fathers and sons, mothers and daughters there are dissensions. But to make it perennial is a symptom of decay of the family, the country, and of the nation. How blessed are those who repent, and step forward to untie the knot which has by chance, marred their mutual relations and do not allow it to get disrupted. 0! God, let the people of India change to this way of thinking. (1883)

("Makers of Modern India", Edited & Introduced by Ramachandra Guha; Tr. By Dr. Shan Muhammad, 2010, p.68-70. Excerpts form his speech).

***